کہانیاں

خالد حسین

جنت گرہن

کہانیاں

جنت گرہن

خالد حسین

کتاب کا نام: جنت گرہن

افسانہ نگار: خالد حسین

پبلشر: چیتنا پرکاشن، پنجابی بھون لدھیانہ

سال: 2020ء

ترتیب اور کمپوزنگ: طارق ابرار

قیمت:

ملنے کا پتہ: چیتنا پرکاشن، پنجابی بھون

فیروز پور روڈ۔لدھیانہ

یاسر عمران

19/2۔گرین ہل کالونی۔بٹھنڈی۔جموں

(پن کوڈ۔181152)

موبائل: +91-9419183485

+91-7006898585

ای میل۔ hussain.khalid47@gmail.com

ویب سائٹ: www.khalidhussain.in

اِسی قلم سے

اُردو افسانوی مجموعے : ٹھنڈی کانگڑی کا دُھواں

اشتہاروں والی حویلی

ستی سر کا سُورج

پنجابی افسانوی مجموعے: تے جہلم وگدا رہیا (شاہ مُکھی لِپی میں)

گوری فصل دے سوداگر (گورُ مُکھی لِپی میں)

ڈونگے پانی دا دُکھ (گورُ مُکھی لِپی میں)

بلدی برف دا سیک (شاہ مُکھی اور گورُ مُکھی لِپی میں)

سُولاں دا سالن (انتخاب۔گور مُکھی لِپی میں

عِشق ملنگی (شاہ مُکھی اور گورُ مُکھی لِپی میں)

دیگر نگارشات: ماٹی کُدم کریندی یار (سوانحِ حیات۔شاہ مُکھی اور گُور مُکھی لپی میں)

میرے رنگ دے اکھّر (پنجابی مضامین۔گُور مُکھی لِپی میں)

گواچی جھانجر دِی چیک (تمل ناولٹ کا پنجابی ترجمہ۔گُور مُکھی اور شاہ مُکھی لِپی میں)

گھر میں ہے بیراگ (پنجابی کہانیوں کا ہندی میں انتخاب)

دشتِ طلب (پنڈت وِدیارتن عاصیؔ کی اُردو شاعری کا انتخاب)

زِندگی کے مارے لوگ (پنڈت وِدیارتن عاصیؔ کی اُردو غزلوں کا ہندی انتخاب)

لفظ قلندر (پروین کمار اشکؔ کی پنجابی شاعری کا انتخاب۔گُور مُکھی لپی میں)

Jannat Grahan

Stories By

Khalid Hussain ©
Near Govt. High School,
Bathindi, Jammu (J&K)
Ph. 094191-83485, 070068-98585 (M)
Email-hussain.khalid47@gmail.com
Website- www.khalidhussain.in

ISBN : 978-93-89997-93-4
Rs. 300/-
2020
Printed and Bound In India

Published by
A Group of
Chetna Parkashan
PUNJABI BHAWAN, LUDHIANA (Pb.) INDIA
KOTKAPURA | CANADA | USA
Ph. 0161-2413613, 2404928, (M) 98152-98459, 98762-07774
Ph.: 95011-45039
Website: www.chetnaparkashan.com
E-mail: chetnaparkashan@gmail.com, gulatipublishersltd@gmail.com

Printer : R.K. Offset, Delhi

انتساب

عزیز ڈاکٹر شہاب عنایت ملک

کے نام

جو جموں و کشمیر میں

اُردو زبان وادب کے فروغ

کیلئے

ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں

جنت مکانی

خالہ رضیہ کی نذر

جِنکی محبت اور شفقت

کی یادیں ہمیشہ

میرے اندر زندہ رہیں گی

ترتیب

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

کہانی ہو تو ایسی ہو

جس طرح ہر انسان ایک نیا چہرا اور ایک نیا رجحان لے کے دُنیا میں آتا ہے اُسی طرح تخلیقی ادب بھی ہر زمان و مکان میں نئے افکار، گونا گوں موضوعات اور جذبات و تاثیرات سے اقلیم سخن کو لبریز کر دیتا ہے چناں چہ خالد حسین کی کہانیوں کا مجموعہ ''جنّت گرہن'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

خالد حسین ایک فطری معتبر کہنہ مشق تخلیق کار ہیں جن کو اپنے فن پر کامل گرفت اور مہارت حاصل ہے ان کے کئی اُردو، پنجابی افسانوی مجموعوں کے علاوہ مختلف عمدہ مضامین، تراجم اور انتخابات نے انھیں منتخب افسانہ نگاروں اور مقبول کہانی نویسوں، عمدہ ادیبوں اور ماہر مترجموں میں شمار کیا ہے۔

اس مجموعے ''جنّت گرہن'' میں بیس اکیس دِل رُبا، دِل کش، دِل گداز، دِل سوز، دِل درد اور دِل میں اتر جانے والی کہانیاں موجود ہیں جو مدتوں دِل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں اور پڑھنے والے کی زندگی میں جذبات کی لہر بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔

قدیم داستانوں اور کہانیوں میں عموماً درباروں اور دُرباروں کی رنگین زندگی کے ساتھ بادشاہوں، امراؤں، پریوں، دیوتاؤں اور جنوں کے قصّے اور اثرات ہمیشہ شامل رہے۔ یہاں منطق اور استدلال کا عمل دخل کم تھا، یہاں عموماً تفریح اور طبیعت کا صرف سرور پیش نظر تھا اس لیے زیادہ تر قدیم کہانیاں ارتقائی اذہان کو اپنی گرفت میں نہ لے سکیں اور اپنے دور ہی میں کتابوں میں دفن ہو گئیں یا دیمک کی غذا بن کر خاک ہو گئیں اور آج چند مقبروں میں تاریخی

کتبوں کی صورت میں موجود ہیں، جیسے انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی''، میر امن کی ''باغ و بہار [چہار درویش]''، حیدر بخش حیدری کی ''آرایشِ محفل''، خلیل علی خاں اشک کی ''امیرِ حمزہ''، بہادر علی حسینی کی ''بے نظیر''، للّو رام کی ''بیتال پچیسی''، مہجور کی ''نورتن''، نیم چند کشمیری کی ''گلِ صنوبر'' اور ''الف لیلیٰ''، ''طلسم ہوش رُبا''، ''فسانۂ عجائب''، ''فسانۂ آزاد'' وغیرہ وغیرہ۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ان داستانوں اور کہانیوں میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کا فقدان ہو بلکہ اس طرف توجہ کم اور تفریحات کی جانب تخلیق نگار کی توانائی زیادہ صرف ہوئی جس کے باوجود ابتدائی دور میں ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور شرر نے اور اس کے دوسرے دور میں مرزا رسوا اور محمد سعید اور درجنوں دوسرے ناول نگاروں نے داستان گوئی کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے کہانی کو حقیقت سے نزدیک اور فنّی تقاضوں سے روشناس کروایا۔ اس کو سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا آئینہ بنایا اور اصلاح کا کام اس کے سپرد کیا چناں چہ ناول کئی راستے طے کر کے راشد الخیری، سجاد حسین وغیرہ سے ہوتے ہوئے پریم چند پر پہنچ کر تکمیل کے مرحلے پر پہنچا۔ پریم چند نے فرد اور ملّت، سماج اور سیاست کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد ناول میں فکر اور جذبات کے ساتھ خلوص اور اصلاح پسندی کے رویّہ سے ناول کے چہرے کو درخشاں کر دیا جو آگے منٹو اور قرۃ العین حیدر کی پہچان اور شناخت بنی۔

زندگی کی تیز رفتار اور مشینی سماج نے ناول کو مختصر کر کے اس کے نقطۂ نظر اور کہانی کو ایک نئی صورت دی جسے ''مختصر افسانہ'' کا نام دیا گیا جس کے پہلے مستند افسانہ نویس پریم چند نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ 1900ء میں ''معارف'' میں چھپ چکا تھا۔ یہاں اس مختصر تحریر میں اس تمہید کی ضرورت اِس لیے بھی ضروری تھی کہ ہم کئی صدیوں میں پھیلے ہوئے کہانی کے اذہان اور ان کے رجحانوں کو سمیٹ کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہر شخص کا چہرہ منفرد ہوتا ہے اُسی طرح ہر کہانی کی تصویر

اور اس کا تاثر جدا ہوتا ہے اور افسانہ نگار کا ذہن جو مبدئے تخیّل ہوتا ہے دراصل ایک نگار خانہ ہوتا ہے جس میں ہر وقت ایک نئے نقش کی نقاشی اُبھرتی رہتی ہے۔

خالد حسین کی کہانیوں میں ان کے وسیع مطالعے سے کئی ایسے تاریخی واقعات بھی ظاہر ہوتے ہیں جو شاید دوسروں کی یادداشت کے ملبوں سے کبھی برآمد نہ ہوں۔ ان کی ''عشق ملنگی'' کہانی جو اُردو کہانیوں کی صف اوّل میں رکھّی جائے گی جموں کے اُردو بازار کی جھلک سینے، الفاظ کا چناؤ، مضامین کا نبھاؤ، مطالب کا بہاؤ جیسے مضامین کی صرف سپاٹ واقعات نگاری نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی فلم آنکھوں اور کانوں کے ذریعے ذہن میں نقش ہوتی جارہی ہے۔ لکھتے ہیں:-

''اُردو بازار بڑا رونق والا بازار تھا۔ یہاں کسبیّوں اور ڈیرے دارنیوں کے چوبارے تھے اور چوباروں کے نیچے پھولوں، عطر، پان، سگریٹ، چائے، دودھ دہی، مٹھائی اور نہاری کی دُکانیں تھیں۔ شیشے، کنگے، پراندے، چُوڑیاں، کنگن، جھمکے اور چھلّے کی چھابڑیاں تھیں۔ برف، کُلفی، شربت، سوڈا اور نمبو پانی کی ریڑھیاں تھیں۔ افیم، چرس، گانجا اور شراب بے حساب دستیاب تھی۔ اس بازار میں ملکہ پُکھراج، اُس کی پھوپھیاں نیلو اور فیلو، ماموں زاد بہن زنیدہ، بھاگو پیرنی کی بیٹی گوہر جان، اقبال بالی، تاجی، زُمّرد، سردار بیگم اور موتی جان اپنے حُسن کے جلوے لُٹاتیں اور موج مستی کے شوقین نوجوانوں، خصاب رنگے اور مہندی رتے عاشقوں کی جیبیں ہلکی کراتیں۔ گانے بجانے کی محفلیں رت جگا کرتیں۔ موتیے، گلاب اور مُول سری کے پھولوں کی خشبویں دِل رُبائی کرتیں۔ الھڑ جوانیوں اور سُریلی آوازوں کا سنگم قیامت ڈھاتا اور من چلے فرشتوں کو ترساتا۔

یہ شاید سن چالیس کی بات ہے کہ پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائیک اور کلاسیکی سنگیت کے ماہر خان صاحب اُستاد عاشق علی خان پٹیالے سے جموں آئے تھے۔ اُنھوں نے ریذیڈنسی روڈ پر بنی کشمیر سوپ فیکٹری کی چھت پر گیت سنگیت کی محفل میں شرکت کی اور اپنی گائیکی کا کمال دکھایا۔ اُستاد عاشق علی خان صاحب کو سننے کے لیے ملکہ پکھراج، گوہر جان، سردار بیگم اور موتی جان بھی آئیں تھی۔ گوہر جان اور سردار بیگم نے تواز راہِ عقیدت خان صاحب کے پاؤں بھی دبائے تھے۔ وہاں کسی نے خان صاحب سے فرمائش کی کہ وہ کُندن لال سہگل کی راگ گندھاری میں گائی ہوئی ٹھمری ''جُھولنا جُھلا وَری، انبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے'' سُنائیں۔ خان صاحب ہلکا سا مُسکرائے اور پھر اُنھوں نے گندھاری شروع کی اور اپنی آواز سے محفل کو مست بنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کے گندھاری کا اصل روپ کیا ہے اور پٹیالہ گھرانے کی لے کاری کسے کہتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے ایک دادرا سُنایا۔ بول تھے۔ ''کہاں گِری رے مورے ماتھے کی بِندیا۔'' محفل ختم ہوئی۔ خان صاحب کی عزّت افزائی کی گئی۔ انعام واکرام سے نوازا گیا۔ شال دوشالے پیش کیے گئے اور کئی رئیس گھرانوں میں اُن کی دعوتیں بھی ہوئی۔ ملکہ پکھراج نے اُن کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور پھر سنگیت کی دُنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔''

کالے خان ایک معمولی ٹانگہ چلانے والا جوان ہے جو گامی نائی کی دوکان کے مقابل چوبارے میں گانے بجانے اور رقص کرنے والی حسینہ فیروزہ کا عاشق ہو جاتا ہے لیکن فیروزہ

اس کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، یہاں کہانی نویس نے گامی نائی سے جو بول بلوائے ہیں وہ کہاوتوں، محاوروں اور دِل سے نکلے ہوئے وہ سُر اور نغمے ہیں جو ہر حساس دل کے تاروں کو چھیڑ کر اس کی سنگیت کو اپنے سنگ کر لیتے ہیں۔ سینئے!

''فیروزہ بی بی! کالے خان تمہارا سچا عاشق ہے۔ وہ تمھیں دِل کی دولت دے سکتا ہے۔ جان تمہارے نام کر سکتا ہے۔ اُس کا عشق اذان کی طرح پاک ہے۔ اُسے تمہارے حُسن نے ٹھگ لیا ہے۔ اُسے تمھیں دیکھنے کا چسکا لگ گیا ہے۔ وہ تڑپ رہا ہے اُس کی زندگی خاک میں نہ ملا، ورنہ اُس کے دِل کی دہلیز کو دیمک کھا جائے گی اور آنکھوں کا کوٹھا ٹپک پڑے گا۔ وہ سرد، گرم موسم میں تمہارا ساتھ دے گا۔ فیروزہ بی بی! جوبن کے دن چار، پھر نہیں ملتے یار، اور جب تن طنبورے کی تاریں ڈھیلی ہو جائیں تو عمر کی سانس اُنھیں کسّ نہیں سکتی۔ مگر کالے خان تیز دوپہر میں تمہاری گھنی چھاؤں بنے گا اور ڈھلتی شام میں تمہارا سہارا۔ بی بی! رُوپ سُروپ کی مایا کا مان نہ کر۔ یہ سب چھّل فریب ہے، مگر اُس کا عشق امبری سیب ہے۔ میٹھا اور جھرّنے کی طرح پاک وصاف۔ فیروزہ! تمہاری دُنیا جھوٹ ہے، اُس کی دُنیا سچ۔ اور جھوٹ سے بڑا چھّل کوئی نہیں جب کہ سچ سے میٹھا پھل کوئی نہیں۔ یہ رئیس زادے اور وڈیرے جسموں کے بھُوکے ہوتے ہیں پر کالے خان تمہاری رُوح کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ تمھیں اپنانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ بے رُخی چھوڑ۔ حُسن کا گمان نہ کر۔ یہ مٹی میں مل جاتا ہے باقی صرف اللہ کا نام رہتا ہے۔''

اُدھر کالے خان کو گامی نائی سمجھاتا ہے۔ ''تمھیں یہ کون سا عشق کا جن چمڑ گیا کہ فیروزہ کے چولہے کی راکھ چھان رہے ہو۔ ان کوٹھے والیوں کے چکروں میں نہ پڑو، ہوش کرو۔ عقل کو ناخن نہ مارو اور دل کے تار کھر پنے بند کرو، خواہشوں کی بستی میں صرف اندھیرا ہوتا ہے۔اس پر بھی کالے خان نہیں مانتا اور فیروزہ سے مل کر کہتا ہے۔

''میں اپنے دِل کے کہنے پر تم سے پیار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اپنی محبّت کا شربت پلا۔ تجھے بسم اللہ کا ثواب ملے گا۔ فیروزہ! میری دِل کی کٹیا میں بڑی سیلن ہے تو موہ کی اگنی بال تا کہ میں ہو جاؤں نہال۔''

اس پر فیروزہ کہتی ہے:-

''خبردار، جو دوبارہ یہاں قدم رکھا، حرام کے تُخم۔خنزیر کی اولاد۔تم جاتے ہو یا بلاؤں مُشٹنڈوں کو۔'' فیروزہ کی اونچی آوازیں سُن کر ایک بھڑوا آیا اور اُس نے کالے خان کو دھکے مار کر کوٹھے سے باہر نکال دیا''۔

ہم نے اس کہانی کے مکالموں اور جملوں کو اس لیے پیش کیا ہے کہ یہاں پلاٹ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے کہانی کی دلچسپی اور حیرت کو بڑھا رہا ہے یہاں الفاظ سے زیادہ اس کے معنی مضمون میں رنگ و بو شامل کر رہے ہیں۔الفاظ کا استعمال لہجوں کا اختلاف یہ بتاتا ہے کہ خالد حسین کو لفظوں پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر، چناں چہ جب وہ محبت اور رحم و کرم کی بات کرتے ہیں تو الفاظ نرم عجز وانکسار سے گردن جھکائے ہوتے ہیں مگر جب وہ گرم اور شعلہ ور کریکٹر کے منہ سے کہلواتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ انگارے اور آتش پیکر بن گئے ہیں جو بڑی تخلیق کی شناخت ہے۔

اس کہانی ''عشق ملنگی'' میں عشق کا انجام، زندگی کے درد اور ہجرت کے سوز و گداز کا

خوب صورت ملاپ ہے جس میں عمدہ جدید محاورے، مقامی الفاظ کی خوشبو کے علاوہ دِل میں پیوست ہونے والے الفاظ کے تیروں کی کمی نہیں۔ کہانی کے آخیر میں نارووال میں پتھر پھوڑنے والا کالے خان کا جملہ ہر حساس دِل کو توڑنے کے لیے کافی ہے جو کامیاب کہانی کی نشانی ہے۔ ''بابو! یہ پتھر تو میں توڑ لیتا ہوں پر فیروزہ کے دل کا پتھر مجھ سے ٹوٹ نہیں سکا۔''

راجندر سنگھ بیدی مختصر افسانے اور کہانی کے ذیل لکھتے ہیں:- ''کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے اور انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی نہیں ڈھونڈیں گے۔ کہانی اٹھتے بیٹھتے پھرتے چلتے سوتے جاگتے آپ کو آلے گی۔'' خالد حسین کی ان دو درجن کہانیوں کو پڑھ کر یہی احساس ہو رہا ہے کہانی کا فن ان کے رگ وپے میں بھرا پڑا ہے، انھیں کہانی کی تلاش نہیں بلکہ کہانی ان کی تلاش میں ہے کہ اس کے خاکے میں یہ اپنی تخلیق کا رنگ بھریں اور اپنے ماحول معاشرے اور زندگی کے ساتھ اور اطراف فضاؤں میں بکھری جوان کہی بے زبان نشانیاں ہیں ان کو الفاظ کے رشتے میں پرو کر کہانیاں بنادیں بلکہ اُسی طرح جیسے مجسمہ ساز چٹان کے اندر صنم دیکھ کر اُسے تیشہ سے آزاد کر لیتا ہے۔

خالد حسین نے انسانی قدروں کو پیش کرنے میں کسی عصبیت یا ایجنڈے سے کام نہیں لیا وہ معاشرے کی اچھائیوں، کمیوں اور خامیوں کا کُھل کر اظہار کرتے ہیں۔ خالد ستم زدہ محرومین کے زخموں کا مرہم تلاش کرتے ہیں۔ خالد کی بیشتر کہانیوں میں وطن کی چاہت مٹی کی محبّت ہجرت کا کرب اغیار اور رشتہ داروں کی بے اعتنائی وغیرہ شامل ہے۔ ''یادرفتگان'' میں

کہانی کا محور رشتے ناتوں کی بے رنگی کا نقش ہے جہاں لہو سفید اور کوکھ کا رشتہ راکھ بن جاتا ہے۔
یہاں بیان میں متانت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ ''عام ساسوں کی طرح اس کی ساس بھی شروع شروع میں انڈے دینی والی مرغی کی طرح اس کے ساتھ کڑ کڑ کرتی رہی۔''

خالد حسین کہانی سے کئی کام لیتے ہیں یہاں زبان دانی کے کمال سے بلیغ بات آسانی سے عامی اور عالم کی فکر میں سما جاتی ہے۔ جدید محلی کہاوتیں ہوں جیسے ''تھنوں سے دھویا ہوا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا۔'' یا ''ایسے سنجوگ بنے کہ آنسوؤں کے گلے آنسو لگے۔''
قتل و غارت کے ذیل میں یہ جملے انسانی فطرت کی شناخت کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔
''زمین کی یہی خصلت ہوتی ہے کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے لاشیں مانگتی ہے اور موت کا کام ہے کہ کھلونے توڑتی رہے اور زمین کا پیٹ بھرتی رہے۔

خالد حسین کی کہانیوں میں بناوٹ نہیں وہ کہانی کی سجاوٹ میں ابرو کی آرایش کرتے ہوئے انکھ نہیں پھوڑتے بلکہ کرداروں کو مرحلۂ اوّل ہی سے موضوع کے قالب میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں۔ عورت پر ظلم اور اس کی ناقدری ہمارے معاشرے کی جہالت کا نتیجہ بھی ہے ''اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رگ'' میں کہانی نویس کو ایک ایسے بداخلاق بے ترتیب جوان کی تصویر کشی کرنی تھی کہ کہانی کی ریل پٹریوں پر چڑھ جائے، یہاں اس کہانی کے آغاز ہی میں اُس کے کرتوت کے ظاہر کرنے کے لیے روزمّرہ، تجنیں، مترادف الفاظ کا سہارالیا گیا۔ یہ تاثیراتی لحاظ سے کامیاب تجربہ ہے۔

قادرا اپنی قسم کا ایک عجیب، سرِ پھرا اور ہٹیلا جوان تھا۔ بھینسے جیسی چال اور گینڈے جیسی کھال۔ ذلالت رزالت، اور خجالت کی کھائی میں غرق، زبان کا کڑوا۔ قادرا چھوٹی چھوٹی باتوں پر رگیں پُھلا لیتا۔ جب دیکھو دانت پیستا رہتا اور مغلظات بکتا رہتا۔ کبھی کسی کی داڑھی

پر ہاتھ ڈالتا تو کبھی کسی کی پگڑی اُچھالتا۔ اُس میں ذرا بھی شرافت نہیں تھی۔ ہمیشہ غلط حرکتیں کرتا رہتا اور رام رولا ڈالے رکھتا۔ وہ آوارہ سانڈ، آگ نِگلتا اور انگارے اُگلتا اور اپنے اندر کی سڑاند باہر نکالتا رہتا۔ قادرا روز صبح تڑکے اپنی بیوی رابعہ کو صلواتیں سُنانی شروع کرتا۔ اُسے پھٹکارتا اور دُھتکارتا رہتا۔ اُس کے دانت گِنتا رہتا۔ لعن طعن کرتا رہتا اور لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر کے اسے لہولہان کر دیتا۔ معمولی سی بات پر اُس کے ماں باپ کو گالیاں بکتا۔ رابعہ درد سے کراہتی رہتی۔ کبھی اُس کا چہرہ سُوجا ہوتا تو کبھی ہونٹ زخمی ہوتے۔ وہ بے چاری اپنے جسم کی چوٹوں کو ٹکوریں کرتی اور زخموں پر مرہم لگاتی۔ مختصر یہ کہ قادرا ہروقت رابعہ کے ساتھ کڑُھ کڑُھ لگائی رکھتا اور اسے جُوتیوں میں روٹی پروستا۔ رابعہ کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ''اندر کُتا باہر کاگ، بچ کے جاؤں کہاں بھاگ۔'' وہ ضدی سانڈ کبھی پیار کی بات نہیں کرتا تھا۔ اکثر اس پر دھونس جماتا اور کہتا، ''سالی کُتیا: تیری اوقات ہی کیا ہے۔ تو تو تین لفظوں کی مار ہے۔۔۔''

خالد حسین کی کہانیوں میں کئی زبان اور بیان کی خوبیاں ہیں۔ کہانی کے لوازمات کے علاوہ موضوع کے وسیع کینوس پر سطروں سے زیادہ سطروں کے مابین مطالب ذہن اور جذبے کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں جن کو عبارت کے پنجرے میں قید کرنا آسان نہیں۔ ہمیں انھیں محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے یہ ان کی کہانیوں کی گیرائی اور گہرائی ہے۔ اس تحریر کو سمٹتے ہوئے ہم خالد کی کہانیوں کے چند اہم نکات اور محاسن یہاں بیان کر دیتے ہیں جن کی روشنی میں آیندہ اسکالرس ان کی تخلیقات میں اُن پھولوں کے نام بھی دیں گے جو ان کے گلشن میں ابھی بے نام ہیں۔ اس گلزار ہست و بود میں لاکھوں پھول ابھی ایسے موجود ہیں جن کے نام ابھی دُنیا نے نہیں دیئے ہیں۔

☼ خالد حسین کی کہانیوں میں پلاٹ یعنی کہانی کی ترتیب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس سے ان کی کہانیوں کی شناخت بھی کی جاسکتی ہے۔ کہانی میں اسی وجہ سے قاری کی دلچسپی اور ذہنی تفریح باقی رہتی ہے۔ خالد کی کہانیوں کی انفرادیت اور عمدگی یہ بھی ہے کہ کہانی کا پلاٹ ایک خاص اور مستحکم نقطۂ نظر کے اطراف گردش کرتا رہتا ہے جس میں ایسے کرداروں کو ہی پیش کیا جاتا ہے جو اس خاص نقطۂ نظر کو گہرا رنگ دے سکیں اور اس طرح کہانی کے کہانی پن کو مزید رنگیں کر سکیں۔

☼ خالد حسین کی کہانیوں کی زبان اُردوئے محلّہ کی شیریں اور سادہ زبان ہے اس میں پنجابی الفاظ اور لہجے کی مٹھاس کام دہن کو شیریں کر دیتی ہے۔ پنجابی محاورے، کشمیری کہاوتیں اور اُردو کی ضرب المثلیں کہانی کے دستر خوان کو خوش ذائقہ اور خوش رنگ بنا دیتی ہیں بلکہ زبان پر اس کا چٹخارہ بڑی مدت تک باقی رہتا ہے۔

☼ اگرچہ بعض کہانیاں طویل ہیں اور بعض مختصر لیکن ان کی کہانیوں کی دِل پذیری اس لیے بھی قایم رہتی ہے کہ ان کے کرداروں کی تراش خراش پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور بعض لکھاڑیوں کے پاس اس پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے کہانی رپورتاژ یا خاکہ نویسی بن جاتی ہے۔

☼ خالد حسین کی کہانیوں میں احساسات کی ندی اور جذبات کا دریا، قدرتی بہاؤ کی طرح ہے، جو کوہ دشت سے گزرتے ہیں چناں چہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے آہستہ اور تیز، سکوت اور شور کے ساتھ رواں دواں نظر آتے ہیں جس میں کہانی سے سچائی اور صداقت چھلکتی رہتی ہے اور اسی سے کہانی پن باقی رہتا ہے۔ جو کہانی نگار کی فطری اپج کی شناخت بھی ہے۔

☼ خالد حسین کی کہانیوں کی خوب صورتی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی کے تاثر کو، جو اُن پر مسلط

ہوتا ہے اُسی طرح سے سننے والے یا کہانی کے پڑھنے والے پر منتقل کر دیتے ہیں، یہی نہیں بلکہ وہ کہانی میں جس طرح زندگی کو دکھانا چاہتے ہیں اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں جو ایک مثبت اور روشن وژن کی علامت بھی ہے۔

☼ خالد کی کہانیوں میں خطیبانہ، واعظانہ یا جارہانہ انداز بیان نہیں۔ ان کی کہانیوں میں جو کردار نگاری کی دلکشی اور حیرت زدگی ہے اُس کی وجہ ان کریکٹروں کی ذہنی نفسیات سے تعلق بھی ہے۔

☼ خالد حسین کی کہانیوں کی بول چال، زبان اور اُسلوب جدید طرز پر مشتمل ہے، پرانی کہانیوں کے متروک الفاظ اور محاورے نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے کہانیاں اکیسویں صدی سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کہانیوں میں غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش ہے۔

☼ ان کہانیوں میں زندگی چھلکتی ہے، یہاں ہر فرد میں نیکی اور اچھائی کی جستجو ہے یہاں ع: ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' کی تلقین ہے۔ یہاں سکّے کے دونوں رخ دکھانے اور دیکھنے کی توفیق ہے۔ یہاں مذہبی صحیفوں میں محبّت اخوت اور انسانیت کی تلاش کی گئی ہے۔ یہاں انسانی حقوق کی پائمالی اور انصاف کی کمی پر سخت احتجاج کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

آخیر میں امید ہے کہ خالد حسین اسی طرح کہانیاں برصغیر کی فضاؤں میں بکھیرتے رہیں کیوں کہ یہ انسانیت کے زخموں کا مرہم ہیں اور یہ دلوں میں بس جاتی ہیں اور

ع : جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہیں

سید تقی عابدی،

ٹورنٹو، کنیڈا

خالد حسین، جنت گرہن: اور افسانہ کی نئی بوطیقا

''جنت گرہن'' جموں کے فساد اور کشمیر کے جہاد کا شاخسانہ ہے۔ فسادیوں اور جہادیوں نے اس دھرتی کے سورگ کے باسیوں کو لل دید اور نند ریشی کے محبتی فرمودات /شلوکوں سے دور کر کے 'اٹوٹ انگ' اور 'شہہ رگ' کے نام پر جس طرح ناپاک مقاصد کے لئے زمین کو لہو سے لال اور ضمیر کو جبر سے پامال کیا، وہی آخر کار جنت میں گرہن کا سبب بن گیا۔ ناعاقبت اندیش اور ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والے سیاست دانوں نے ''ستی سر'' کے چاند سورج کو پس پُشت ڈال کر اس دھرتی پر کھیت کھلیانوں سے لے کر سیاست اور قانون کے ایوانوں تک جھوٹ، فریب اور مکاری وعیاری کے وہ وہ تماشے کئے گئے کہ صدیوں کے مظالم اور طوائف الملوکی کی داستانیں پھیکی پڑ گئیں۔ گھر آنگن کے اُجڑنے، موت کی فصل کاٹنے اور عزت و آبرو کے لُٹنے کے ایسے ایسے واقعات ہوئے کہ ''جنت''، عملی طور پر 'جہنم' میں بدل گئی۔ خالد حسین نے اپنے تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن''، میں، سیدھے سُبھاؤ اِس گرہن زدہ جنت/جہنم کے 'گربھ' سے اٹھنے والی سِسکیوں کو ہی اپنی کہانیوں اور افسانوں کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ اس طرح کہ یہ کہانیاں اور افسانے جموں و کشمیر کی روزمرہ کی زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے بن گئے ہیں۔ جنت گرہن کے افسانے لکھ کر ایک طرف جہاں خالد حسین نے اپنی مٹی کا قرض اتارا ہے وہیں دوسری جانب، اپنے مخصوص انداز میں افسانہ نگاری کے عصری مزاج اور معیار کا ساتھ بھی نبھایا ہے۔ عالمی سطح پر بھی افسانوی ادب (فکشن) کا عصری رویہ یہی ہے کہ اپنے مانوس ماحول اور معاشرہ کے سچے حالات وکوائف کو اس کی جُزیات کے ساتھ

ایمانداری سے بیان کیا جائے۔ خالد حسین کے سابقہ مجموعوں کی طرح ''جنت گرہن'' کے افسانوں میں بھی ایسا ہی سچا اور ایماندارانہ تخلیقی رویہ ملتا ہے۔ جدید اور مابعد جدید افسانہ نگاری کے اس دور میں 'جنت گرہن کے افسانے' 'معاصر افسانہ' کی شعریات سے بہ یک وقت مفاہمت اور مزاحمت دونوں کا رشتہ نبھاتے ہوئے بھی افسانے کی ایک الگ ہی قسم کی ''بوطیقا'' کے خدوخال نمایاں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

دراصل آج کی تاریخ میں ''افسانہ'' وہی ہے جس میں صرف کہانی ہی نہ ہو، کہانیاں جنم دینے والی سماجی، ثقافتی اور معاشی سچائیوں کا بصیرت مندانہ بیان Visionary (Narration) بھی ہو۔ ''ستی سر کا سورج (اردو) اور ''عشق ملنگی (پنجابی) سے لے کر ''جنت گرہن'' جیسے کئی افسانوی مجموعوں کے وسیلے سے انفرادو اعتبار کی بلندیوں پر فائز ہونے والے افسانہ نگار خالد حسین کا شناختی امتیاز ہی یہی ہے کہ ان کے افسانوں میں دل دریا میں ہلچل پیدا کرنے والی کہانیاں بھی ہوتی ہیں اور ذہن، ضمیر کو جھنجھوڑنے والی بصیرت مندیاں بھی۔ ویسے بھی آج کے معاشرہ کا سماجی، سیاسی اور ثقافتی منظر نامہ افسانہ نگار سے محض دل بہلانے والی کوری تصوریت اور خیال آرائی کا نہیں، بلکہ تعمیری بصیرت مندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور سچا افسانہ نگار بھی وہی ہے جو اپنے ماحول اور معاشرہ کو درپیش عصری چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں تحیرت اور بصیرت مندی کے نئے چراغ روشن کر سکے۔ خالد حسین ایسے ہی افسانہ نگار ہیں اور پنجابی اور اُردو افسانوی ادب میں ان کے معتبر مقام و مرتبے کا ایک جواز یہ بھی ہے۔ خالد حسین کے تازہ ترین مجموعہ ''جنت گرہن'' میں شامل اکثر افسانوں سے بھی اس کی تشریح ہوتی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہر افسانہ نگار اپنی ذات، روزمرہ زندگی اور زمانہ کے ماضی یا حال کی

کہانیوں کے حصار میں ہی جیتا ہے۔ لیکن ان کہانیوں کو صرف بیان کر دینے والا، یا تو محض قصہ گو ہوتا ہے یا بھانڈ۔ اور یہ افسانہ نگاری نہیں، جبکہ آس پاس بکھری، پسری کسی بھی کہانی کو افسانہ بنانا ہی حقیقی افسانہ نگاری ہے۔ لیکن ذہن یہ سوال کرے گا کہ کہانی کیا ہے اور افسانہ کسے کہتے ہیں تو خالد حسین کے افسانوں سے ہی اس کا جواب یہ نکل کر آتا ہے کہ محض دل بہلاوے یا وقت گذاری کے لئے دلچسپ انداز میں واقعہ یا واقعات کا بیان کہانی ہے، لیکن جب کہانی اس طرح سے بیان کی جائے کہ اس میں قاری کی ذات، ذہن اور ضمیر۔۔۔۔ اپنے ماحول اور معاشرہ کی سماجی اور ثقافتی سچائیوں کے سمیت، تمام ترفنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ 'بیانیہ' میں ڈھل جائے تو اسے ''افسانہ'' کہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کُلیہ بھی نہیں، کیونکہ ہر عمدہ فن پارہ، شعر ہو یا افسانہ، بہر حال ایک ''بھید بھرا بستہ'' ہوتا ہے جس کی ''تھاہ'' پانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ خالد حسین کے پائے کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی جتنا کچھ روشنی میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ واقعات اور کردار پہلو بہ پہلو چلنے والے ان کے تبصروں/ اسٹیٹمنٹ میں پنہاں ہوتا ہے جسے پڑھنے والا اپنے ذہن اور ذوق کی بنا پر 'غیاب' سے 'ظہور' میں، اندھیرے سے اُجالے میں لاتا ہے۔ خالد حسین کی افسانوی کائنات سے، ایک باضمیر اور حساس انسان کی طرح گزرئے تو اندازہ ہوگا کہ، سابقہ مجموعوں کی طرح ''جنت گرہن'' میں بھی خالد حسین کے بیانیوں (NARRATIVES) میں 'کہانی' اور افسانہ دونوں کی خصوصیات ایک ساتھ رواں دواں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ اور عام فہم اظہار و بیان کے ساتھ ساتھ استعاراتی، تمثیلی اور اساطیری نثر کی وجہ سے ''جنت گرہن'' کے افسانوں میں 'بیانیہ' آج کا ہے، اس لئے افسانہ ہے۔ لیکن اس بیانیہ کی جڑیں گذرے ہوئے وقتوں کی یادداشتوں

اور باز گشتوں میں بھی پیوست ہیں اس لئے کہانی بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں خالد حسین ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے عصری 'ڈسکورسیز' اور Narratives کی آنچ میں پکے ہوتے ہیں لیکن ان کے پاؤں قصہ گوئی یا 'کتھا واچن' کی روایات اور رسومیات کو بھی گُدگُداتے ہیں۔ خالد حسین کے تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''جنت گرہن'' کا نام ہی بھیدوں بھرا ہے۔ جنت' اور گرہن دونوں ہی الفاظ ریاست جموں کشمیر اور اس ریاست/ یو. ٹی کے موجودہ بد سے بدتر حالات کے استعارے ہیں۔ اور جنت گرہن میں شامل نو افسانے بھی، جموں کشمیر کے منفرد ''اجتماعی تشخص'' کے نو' رس' ہیں۔ جن میں تقسیم ملک سے لے کر آج تک کے ان تمام اسباب کا ''منتھن'' کیا گیا ہے جن کے سبب اس 'جنت' کو 'گرہن' لگا ہے۔ تقسیم ملک نے اس جنت کے مکینوں کو جو زخم دئے تھے ان کا 'مداوا' آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد، بچے کھچے جموں کشمیر اور لداخ کو بھی ٹکڑوں میں بانٹنے کا فیصلہ کیا گُل کھلائے گا اس کا اندازہ تو شائد ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرنے والے ارباب اقتدار کو بھی نہیں۔ لیکن خالد حسین نے 'جنت گرہن' میں اپنے مخصوص، اور تسلیم شدہ لسانی اور تخلیقی رویوں کے ساتھ، جن عوامی مسائل و مشکلات، خدشات، توقعات، اور تعصّبات کی نشاندہی کی ہے وہ چشم کشا (آنکھیں کھول دینے والے) ہیں۔ چاہ کر بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل صرف ''جنت گرہن'' ہی نہیں دوسرے سابقہ مجموعوں خصوصاً ''ستی سر کا سورج'' کے افسانوں کو بھی ذہن میں رکھیں تو پتہ چلے گا کہ خالد حسین کے ہر افسانے میں کئی کئی سوالیہ نشانات ہوتے ہیں۔ یوں بھی اچھے افسانے کی پہچان بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ ذہن میں ایک اضطراب ایک بے چینی پیدا کردے اور حدِ خیال تک جذبہ واحساس اور فکر و خیال کی موجیں ابھرتی ڈوبتی چلی جائیں۔ جنت گرہن میں بھی ''عشق ملنگی'' یادِ رفتہ اور

''اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رگ'......وغیرہ، ہر افسانہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ خالد حسین نے دنیا دیکھی ہے لیکن اس کے ہوش وحواس اور، فکر وفن نے پَل پَل اور تِل تِل جنت نظیر کشمیر (جموں کشمیر اور لداخ) کو جیتے مرتے، لُٹتے، بٹتے اور برباد آباد ہوتے بھی دیکھا اور 'جِیا' ہے۔ اسی لئے خالد حسین کے افسانوں کے مرکز اور محور میں ہمیشہ جموں کشمیر ہی ہوتا ہے ۔ تقسیمِ ملک، فسادات اور، ہجرت کی داستانیں لکھ سُن کر آنسو تو بہت بہائے جا چکے ہیں۔ لیکن ان سب کے بعد عسکریت پسندی، فوجی کاروائی اور 'اٹوٹ انگ' اور 'شہہ رگ' کے دعووں کے باوجود اس ''جنت'' کو ''گرہن'' کیسے لگا؟ اور کیوں لگا اور اِدھر سے اُدھر ہو جانے یا کردئے جانے والوں پر کیا گزری۔ وہ کون لوگ تھے، کہاں کے تھے جو یہاں یا وہاں بس کر بھی اجڑ گئے۔؟ کیوں وہ اپنی دھرتی 'جموں کی مُٹھی بھر خاک کی حسرت لئے خود خاک میں مل گئے۔؟ دیارِ غیر میں دفن جموں کی باجی بلقیس کی قبر پر جموں سے لائی ہوئی مٹی ڈال کر خالد کیوں پھوٹ پھوٹ کر رویا؟ سوالوں کا ایک ختم نہ ہونیوالا سلسلہ ہے، جو خالد حسین کے افسانوں میں لفظ لفظ سامنے آتا ہے لیکن صحیح معنوں میں یہ خالد حسین کے دل وجاں سے ٹپکتے لہو کے قطرے ہیں جو لسانی برتاؤ سے گزر کر افسانہ کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ یہ سوالات، یہ لہو کے قطرے کہیں تو واضح ہیں تو کہیں بین السطور پنہاں جنہیں 'احساس' کے دیدۂ بینا سے ہی دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً،

> ''اتنا بڑا زلزلہ کیسے آیا؟..اور کیسے اس بھونچال نے انسانیت کو اندھا کردیا۔ کروڑوں اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے کالے خاں حیران تھا کہ یہ کیسا تنازعہ تھا کہ جسے کوئی حل نہ کر سکا۔ جبکہ صرف ایک کلمے کا فرق تھا ورنہ ہندو اور مسلمان پیار میں غرق تھا۔ شاید مذہب اپنے وجود کا قیدی ہوتا

ہے، جبھی تو تباہی مچاتا ہے۔''

افسانہ۔ عشق ملنگی۔ جنت گرہن

''واہیگو رونے چاہا تو تم دونوں ماں بیٹی جلد سرحد پار چلے جاؤ گے۔ سر پنچ کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اگر ماں پاکستانی ہے تو اس کی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹی کیسے ہندوستانی ہو گئی .... اگر کوکھ پیدائش کا پیمانہ نہیں تو جالندھر اور دہلی میں پیدا ہوئے کیسے پاکستان کے حاکم بن گئے؟ اور جہلم اور چکوال میں جنم لینے والے کیسے ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے؟ کیا حدیں اور سرحدیں ان لوگوں کے لئے کوئی معانی نہیں رکھتیں؟ کیا قانون اور ضابطے سب غریبوں کے لئے ہوتے ہیں۔؟''

''افسانہ؛ اٹوٹ انگ میں پھنسی شہہ رگ۔ ص۔ ۴۹،۵۰۔

خالد حسین کے اس طرح کے افسانوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر، فکشن میں عالمی پیمانے پر برتتے جارہے تخلیقی، فکری اور اظہاری رویوں کی پاس داری ملتی ہے۔ گیبریل گارشیا مارکیز سے لے کر آج تک جتنے بھی فکشن نگاروں کو ''نوبل پرائز'' سے نوازا گیا ہے ان میں ایک بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر ایک نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اپنے ماحول اور معاشرہ کے سماجی، تہذیبی، معاشی اور مذہبی واخلاقی عروج وزوال کی بھی، سادہ یا استعاراتی اسلوب میں ترجمانی کی ہے۔ پنجابی اور اردو میں، خالد حسین کے افسانے اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دراصل بیسویں صدی کے وسط سے ہی، نو آبادیاتی صورت حال (ColonialConditions) سے دوچار ملکوں، کے افسانوی ادب میں (جن میں ہندوستان بھی شامل ہے)، بڑے اور مرکزی سماجوں اور ثقافتوں کی بجائے

چھوٹے اور ذیلی سماج اور ثقافتیں (Subaltern Societies& Cultures) زیادہ اہم اور پُرکشش محرک (Provocative Motives) ثابت ہوتی رہی ہیں۔ ۴۷ء میں بر صغیر (ہندوستان اور پاکستان) آزاد تو ہو گیا ہے لیکن شائد ''نو آبادیاتی سوچ اور فکر سے ہم ابھی بھی پورے طور پر آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ جموں کشمیر بھی اس سے مستثنی نہیں ہے، اسی لئے جموں کشمیر میں بھی عام لوگوں کو گونا گوں چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی لئے ریاست کے ادیبوں اور فن کاروں کے تخلیقی سر چشمے علاقائی سیاسی وسماجی، معاشی وثقافتی منظر نامہ کے ''گربھ'' سے ہی پھوٹ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو، خالد حسین کی سب سے بڑی تخلیقی اور فکری قوت (Power) ان کی ارضیت/ علاقائیت ہی ہے۔ جنت نظیر جموں کشمیر کے شہروں کے علاوہ، لاٹی، بیرڑا، بٹالک، ......جیسے دور دراز چھوٹے گاؤں دیہاتوں کے ''جہنمی حالات کو بھی خالد حسین نے مانوس اور غیر مانوس جزئیات کے ساتھ جس طرح پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس جنت کو گرہن کیوں لگا اور اس کے لئے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ خالد حسین نے بڑی جرات مندی کے ساتھ جنت کو گرہن لگانے والے اسباب اور افراد کو بے پردہ کیا ہے۔

''جنت گرہن'' کے ابتدائی افسانے ''جموں مرکز'' افسانے ہیں۔ جن میں خالد حسین نے صوبہ جموں کو جس طرح چاروں کھونٹ سے ''جیا'' ہے اس کی مثال شائد کسی اور زبان کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملے گی۔ ''جنت گرہن'' کے پہلے افسانے ''عشق ملنگی'' سے ہی شروعات کریں۔ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بیدی کے ''لاجونتی'' کرشن چندر کے ''کالو بھنگی''، بلونت سنگھ کے ''جگا'' خواجہ احمد عباس کے ''سردار جی'' کی طرح ''عشق ملنگی'' بھی ایک 'کرداری افسانہ ہے۔ پورے افسانے پر مرکزی کردار کالے خاں کا سایہ ہے۔

کالے خاں کو جوان، فیروزہ کسبی کا عاشق صادق تھا اور اسکے سر پر عزت کی چادر ڈالنا چاہتا تھا۔ پھر سن ۴۷ کا زلزلہ آیا تو بے گھری اور بے دری کے عالم میں فیروزہ کہاں گئی کچھ پتہ نہ چلا۔ عشق کا مارا کالے خاں ملنگ ہو گیا۔ اس ''عشق ملنگی'' میں اسے دنیا کی کوئی خبر نہ رہی اسے اس کا ہوش بھی نہ رہا کہ وہ کب کیسے فیروزہ کی خوشبو سونگھتا ہوا جموں سے نکل کر سیالکوٹ جا پہنچا۔ ''عشق ملنگی'' میں خالد حسین نے کالے خاں اور اس کے 'ملنگی عشق' کو افسانہ کے مرکز میں رکھا ہے لیکن اصلاً یہ خود خالد حسین کے جموں کے ساتھ 'عشق ملنگی'' کا استعارہ بھی ہے۔ جموں سے اس عشق کی برکتوں کے طفیل ہی خالد حسین نے ۴۷ء سے قبل کے جموں کو اس طرح زندہ کیا ہے جیسے کوئی بوڑھا عاشق اپنی بچھڑ جانے والی معشوقہ کی جوانی کو اپنی یادوں کی دنیا میں زندہ کرتا رہتا ہے۔ خالد حسین نے ''ستی سر کے سورج'' کی طرح ''عشق ملنگی میں بھی 'جادوئی حقیقت نگاری، Magical Realism کی تکنیک اپنائی ہے۔ اس تکنیک میں جذبات و کیفیات کا بیان غیر آرائشی طور پر سچائیوں کے امکانات روشن کرنے کے لئے ہوتا ہے، ایک کہانی میں کئی کہانیوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ مرکزی کہانی کے ساتھ چلنے والے افسانہ نگار کے تبصرے، Statements افسانے کی ساخت میں کہیں کہیں مضمون کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن آج کے منطقیت پسند دور میں یہ عیب نہیں ہنر ہے۔ اسپینی اور لاطینی امریکی فکشن نگاروں مثلاً گیبریل گارشیا مارکیز، جان بارتھ، اور بورخیس وغیرہ کی افسانوی تحریروں میں اس تکنیک کا استعمال ملتا ہے۔ Magic Realism کی تکنیک کے حامیوں کا ماننا ہے کہ سچائیوں Realities کو کسی بھی طرح کی مبالغہ آرائی کے بغیر راست اور بے کم و کاست بیان کر دینے سے بھی ایک طرح کی 'جادوئی کیفیت' پیدا ہو جاتی ہے۔ ''عشق ملنگی'' 'یادِ رفتہ' اور کئی دوسرے افسانوں میں خالد حسین

نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی ''جادوئی حقیقت نگاری'' کی تکنیک کو اپنے مخصوص اختراعی لسانی چاشنی کے ساتھ برتا ہے۔ چنانچہ اس جادوئی تخلیقی رویہ نے ''عشق ملنگی' کو افسانہ کے مقام سے بہت بلند کر کے اسے ایک تاریخی سماجی، اور ثقافتی دستاویز کے منصب پر فائز کر دیا ہے۔ ۴۷ء. سے قبل اور بعد کے جموں کے بازاروں، مزاروں، گلی چوباروں اور محلوں کوٹھیوں میں روحانی طور پر موجود، جدید ذہن کے مالک خالد حسین ، جموں کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور رومانی دائروں اور زاویوں کے بارے میں اپنے جذبات و کیفیات کے اظہار و بیان کا ایک ''بے ریا'' اور سچا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ''عشق ملنگی، 'شہر خموشاں کا فرشتہ' جوتی قصوری' اور ان کے دیگر کئی افسانوں میں، یادداشتوں اور بازگشتوں کا سلسلہ خالد حسین کی ذات سے شروع ہو کر خالد حسین تک بھی لوٹتا ہے اور قارئین کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے یہ خالد حسین کے فن کا جواز بھی ہے، اور فنی پختگی کی دلیل بھی۔

''جنت گرہن'' کا پہلا ورق الٹتے ہی، (عشق ملنگی میں) قاری جموں کے مرحوم ''اردو بازار'' کے گامانائی اور اس کے چڑیا خانہ کا نظارہ کرتے ہوئے کالے خان کے ٹانگے پر سوار ہو کر، گُمٹ، پنج تیرتھی، نہر ستواری، تالاب کھٹیکاں میں وزیر وزارت سردار اکرم خاں کی حویلی اور محلّہ جیون شاہ کے دیاروں اور دیواروں کا بھیگی آنکھوں سے نظارہ کرتا ہے۔ خالد حسین، بوڑھی نسلوں کی یادداشتوں کو کریدتے اور اپنے ثقافتی ورثے سے انجان نئی نسلوں کو ماضی قریب کے جموں شہر سے روشناس کرواتے ہوئے اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ تقسیم ملک اور فسادات میں لٹنے اُجڑنے سے پہلے شہر جموں کی رونق ''اردو بازار'' سے ہی تھی۔ خالد حسین نے اپنے حافظے میں سجو کر رکھے ہوئے اردو بازار کے

نقشے کو کاغذ پر اس طرح اتارا ہے،

''اردو بازار سنہ سینتالیس سے پہلے بڑا رونق والا بازار تھا۔ یہاں کسبیوں اور ڈیرہ دارنیوں کے چوبارے تھے اور چوباروں کے نیچے پھولوں، عطر، پان، سگریٹ، چائے، دودھ دہی، مٹھائی اور نہاری کی دوکانیں تھیں۔شیشے کنگھے، پراندے، چوڑیاں، کنگن اور چھلے کی چھابڑیاں تھیں۔ برف گلفی۔شربت سوڈا اور نمبو پانی کی ریڑھیاں تھیں۔افیم، چرس، گانجا، اور شراب بے حساب دستیاب تھی۔اس بازار میں ملکہ پکھراج، اس کی پھوپھیاں نیلو اور فیلو، ماموں زاد بہن زبیدہ، بھاگو پیرنی کی بیٹی گوہر جان، اقبال بالی، تاجی، زمُرد، سردار بیگم اور موتی جان اپنے حسن کے جلوے لُٹاتیں اور موج مستی کے شوقین نوجوانوں، خضاب رنگے اور مہندی رتے عاشقوں کی جیبیں ہلکی کراتیں۔گانے بجانے کی محفلیں رت جگے کرتیں۔موتئے، گلاب اور مولسری کے پھولوں کی خوشبوئیں دل ربائی کرتیں۔الھڑ جوانیوں اور سُریلی آوازوں کا سنگم قیامت ڈھاتا اور من چلے فرشتوں کو ترساتا۔''

افسانہ؛عشق ملنگی

لیکن جب مذہب کے نام پر ۴۷ء ہوا تو اسی جموں شہر کا نقشہ کچھ ایسا ہو گیا،

'' مذہب اپنے وجود کا قیدی ہوتا ہے۔جبھی تو تباہی مچاتا ہے ۔فسادیوں نے قہر ڈھایا۔سب کچھ چھین لیا افراتفری مچ گئی لوگ سانسوں کے بھوکے اپنی جڑیں کاٹ کر بھاگ گئے۔جولاہکہ محلّہ،

دلپتیاں، پیر مِٹھا، تالاب کھٹیکاں، محلّہ افغاناں اور استاد محلے کی بستیاں
خالی ہوگئیں۔توی، اُوجھ اور بسنتر کی ندیوں کے پانی کا رنگ لال ہوا۔ بچہ
سقہ کی طرح چیلوں ،کوؤں اور گِدھوں کو بھی کچھ دنوں کا راج ملا۔ کچا
گوشت کھانے یہ مخلوق بڑی خوش تھی، کیونکہ انہیں پہلی بار الگ قسم کا لذیذ
گوشت کھانے کو ملا تھا۔ لاشوں کا بیوپار ہو رہا تھا لاشیں آ رہی تھیں اور
لاشیں جا رہی تھیں ...ایک پل کے فیصلے نے ہماری تہذیب ہمارا تمدن ہم
سے چھین لیا۔صدیوں کا بھائی چارہ بھیڑیوں نے چیر پھاڑ دیا۔قتل و
غارت اور بھاگ دوڑ کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔پھر آندھی اور طوفان
تھم گیا، جموں کی خالی بستیاں نئے لوگوں نے آباد کیں۔"

افسانہ۔عشق ملنگی

"راج ناتھ راز دان کو جو میر النگوٹیا تھا قبائلیوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا....احمد
شیخ نے سمسار چند کی مخبری کی تھی اور قبائلیوں نے اُسے اور اُس کے پورے خاندان کو بے
دردی سے مار ڈالا تھا اور ان کی ساری جمع ہونجی لوٹ کر لے گئے تھے۔....لسہ کول ریڈیو کشمیر کا
ڈائریکٹر تھا..لیکن جنگجو اسے بھارتی جاسوس اور مخبر سمجھتے تھے اور اسی الزام میں اسے مار دیا گیا۔
...مرنے والوں کی لاشوں کو قبروں سے باہر نکالا گیا اور ان کا ڈی.این.اے ٹیسٹ کروایا
گیا...جب کہ چٹی سنگھ پورہ اور کولگام کے شہیدوں سے متعلق کوئی کمیشن بھی نہیں بنایا گیا۔"

افسانہ۔زندہ آنکھوں کی داستان

لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ جموں کا ہر ہندو مسلمان ایک دوسرے کا دشمن ہی ہو گیا تھا
۔مذہب کو دل دروازے سے باہر رکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد برسوں

کی یاری اور دلداری نبھاتی بھی رہی،

''خواجہ حمید بڑا دلدار شخص تھا۔اس کی یاری جموں کے امیر زادوں ،فقیرزادوں اور غنڈے موالیوں سب کے ساتھ تھی اسی لئے جب مار کاٹ شروع ہوئی تو اسکے بچپن کے دوست اور ہمسائے بلرام پنڈت نے خواجہ حمید کو اپنی پاٹھ شالہ میں چھپا کر رکھا لیکن اس کے ماں باپ بھائی اور کئی دوسرے رشتہ دار بلوائیوں نے گھروں کے اندر ہی مار ڈالے''۔

افسانہ۔یادِرفتہ

۱۹۴۷ء۔میں جو قتل و غارت گری ہوئی اس کے بارے میں چشم دید گواہ ادیب اور مورخین دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔لیکن خالد حسین نے ان کے حوالے نہیں دئے ہیں۔یوں بھی زمین ہو یا کاغذ، خالد حسین زخموں کو کریدنے سے زیادہ مرحم لگانے پر یقین رکھتے ہیں۔لیکن وہ بھی اس عام خیال کو دہرانے سے خود کو نہیں روک پاتے کہ

'راجے نے راج دھرم نہیں نبھایا۔وہ بھی کیا کرتا،وہ خود بے بسی کی بھٹی میں جل رہا تھا۔پھر نئی سرکار نے جنم لیا۔.....عوام کو یقین دلانے لگی کہ ان کی جان کو اب کوئی خطرہ نہیں۔پر سرکار کو کون سمجھائے کہ تھنوں سے دوہا ہوا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا''

افسانہ۔یادرفتہ

خالد حسین نے جموں ہی نہیں پوری ریاست جموں و کشمیر کی سیاست،سماج اور اور ثقافت کو کروٹیں بدلتے بہت قریب سے دیکھا ہے۔خاص طور ۱۹۹۰ء.کے آس پاس سے شروع ہونے والی عسکریت پسندی/مِلی ٹینسی ،کے آغاز کے اسباب،اس کے سنگین اور

عبرتناک نتائج اوران سب کے لئے ذمہ دارعناصر سے متعلق خالد حسین اپنی آزاد، منطقی، سیکولراور تعمیری رائے رکھتے ہیں لیکن کشمیر کی ''عسکریت پسندی'' ایک انتہائی نازک اور حساس مسئلہ ہے اگراس موضوع پر لکھتے ہوئے احتیاط نہ برتی جائے تو سر پر ''دیش دروہ'' کی تلوار بھی لٹک سکتی ہے۔لیکن خالد حسین نے اس موضوع کو ایک محبِ وطن اور ذمہ دار شہری اور بالغ نظرافسانہ نگار کی حیثیت سے، اپنے افسانہ ''کنواں اورکھائی''، میں جس طرح افسانے کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ ہرکس و ناکس کے بس کی بات نہیں ۔ حالانکہ اس افسانہ میں ''افسانویت''، یعنی Story Line پر حقائق کے تجزیاتی عنصر کا غلبہ ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آج 'عسکریت پسندوں، کشمیری عوام اور حکومت، سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے اسی قبیل کے افسانوں کی ضرورت بھی ہے۔ عسکریت پسندی کے اسباب سے متعلق ایک تھیوری یہ ہے کہ صدیوں سے جاری ''جبرِ مسلسل''، کے ردِعمل کے طور پراس کا آغاز ہوا۔خالد حسین کے لفظوں میں،

''لوگ اپنی اپنی پسند کے موسم میں جینا چاہتے ہیں مگر جی نہیں سکتے۔ وقت کے جبر نے ان کا جینا حرام بنا دیا ہے۔حاکم ،عوام کو اپنا غلام بنانے کے لئے ،طاقت کے ساتھ ساتھ فنکاری، مکاری اور عیاری سے بھی تاریخ رقم کرتے ہیں۔حاکم کے حکم کے مطابق لوگ سروں پر پگڑی نہیں باندھ سکتے، بلکہ گلے میں صافہ اور مُنہہ میں گھاس کا تنکا رکھتے ہیں۔آزادی میں غلامی کی یہ رسم آج بھی چلتی ہے اور نہ جانے کب تک چلتی رہے گی ۔چنڈالوں اور سیاسی دلالوں کی وجہ سے آزادی ایک جُرم کی طرح ان کے نام لکھی گئی ہے اندھا پیسے اور گُتا چاٹے والی سرکار ہے۔صرف تاریکی ہے

روشنی کا نام ونشان نہیں ۔آج سادھ جھوٹا اور چور سچا ہے۔اس ماحول میں
کوئی بھی اپنے دل کی زمین میں خوشی کے پھول کیسے اُ گا سکتا ہے۔ چاروں
طرف بارود کا دھواں، گرد وغبار...آگ کے شعلے، شور شرابا اور لاشوں کی
سڑاند نے وحشت پھیلا رکھی ہے۔''

افسانہ۔کنواں اور کھائی

ایک دوسری تھیوری گھر کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ کی جانے والی زور زبردستی اور زیادتی سے متعلق ہے۔اس حوالے سے خالد حسین نے جو منظر کشی کی ہے، اسے جُھٹلایا نہیں جا سکتا،

''گھروں کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنی ماؤں، بہنوں، بچیوں اور بیویوں کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی دیکھیں کپڑے ...تار تار اور خون آلود تھے .....پھر گاؤں کے کچھ جیالے جوانوں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔وہ مِلی ٹنٹوں کے سرپرستوں سے ملے جنہوں نے..ان کے ذہن پراگندہ کر دئے ۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہتھیار کسی کے یار نہیں ہوتے وہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ لینے کے لئے سرحد پار چلے گئے۔''

افسانہ کنواں اور کھائی

تیسری اور مصدقہ تھیوری یہ ہے کہ پاکستان کی اِیما پر کشمیر کے نوجوانوں کو سبز باغ دکھا کر پاکستان لایا جاتا ہے اور تربیتی کیمپوں میں مذہب کے نام پر ان کی Brain Washing کر کے دہشت گردی پھیلانے کے لئے واپس کشمیر بھیجا جاتا ہے۔ نوجوانوں کی تربیت اور 'برین واشنگ' کس طرح کی جاتی ہے اس کا خلاصہ خالد حسین نے

اس طرح کیا ہے،

''ٹریننگ شروع ہوئی۔ ہتھیار چلانے کے ساتھ ساتھ ''اسلام' کے نئے نئے معنی بھی سمجھائے جانے لگے۔ بنیاد پرستی کے منتر رٹائے گئے جنت کے خواب اور دوزخکی کہانیاں سنائی جانے لگیں، شہید اور غازی کے فلسفے بتائے گئے، کافر اور مومن کے فرق بیان کیئے گئے۔''

افسانہ۔ کنواں اور کھائی

کشمیر کی معاشرت میں 'آرمی' ایک مستقل ''منفی کردار'' کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے ٹھوس اسباب بھی ہیں ۔۱۹۹۰ء. کے آس پاس، عسکریت پسندی کے زیر سایہ قلم اٹھانے والے نوجوان افسانہ نگاروں، ریاض توحیدی، غلام نبی شاہد، مشتاق مہدی اور ناصر ضمیر وغیرہ نے اس پر احتجاجی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن خالد حسین چونکہ ہمیشہ 'نفی' میں 'اثبات' یا 'تخریب' میں مضمر 'تعمیر' کے پہلو ڈھونڈنے اور نکالنے کے عادی رہے ہیں اس لئے افسانہ ''زندگی کے مارے لوگ'' میں انہوں نے ایک باضمیر فوجی افسر کرنل آدرش بھاٹیہ کا مثالی کردار پیش کیا ہے جو فوج کے ہاتھوں مارے جانے والے 'کلتورا' گاؤں کے ایک معصوم غریب مزدور غلام علی کی ہلاکت کے بعد اس کی بے سہارا بیوہ اور بیٹی کی کفالت کرتا ہے ۔آدرش نے غلام علی کی بیٹی 'رُخسانہ' کو اپنی بہن بنالیا۔ آدرش، کرگل جنگ میں 'بٹالک' کے محاذ پر دشمن سے جنگ کرتا ہوا شہید ہوگیا لیکن مرنے سے پہلے، خط لکھ کر رخسانہ کی ذمہ داری اپنے پِتا کرنل نرمل بھاٹیہ کو سونپ گیا۔ کرنل نرمل بھاٹیہ نے بھی اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے 'رخسانہ کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں برتی اور رخسانہ کو اپنی سگی بیٹی کی طرح پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ لیکن خالد حسین 'لال بازار اور جامعہ مسجد کے علاقوں میں مظاہرین پر

''پیلٹ گن اور'اسالٹ رائفلوں سے گولیاں چلائے جانے کے واقعے کے حوالے سے، رخسانہ کی زبانی یہ حقیقت بھی بیان کرتے ہیں کہ،

''...کچھ نہیں بدلا ہے۔آج بھی نہتے غلام علی گولیاں کھا رہے ہیں ۔آج بھی معصوم اور بے گناہ مر رہے ہیں۔آپ کتنے یتیموں کا پالن پوسن کریں گے، کتنوں کا گھر آباد کریں گے۔آپ تھک جائیں گے۔''

افسانہ ''زندگی کے مارے لوگ''

ویسے ''جنت گرہن'' یعنی کشمیر کے موجودہ حالات کے لئے خالد حسین بڑی ایمان داری سے دونوں ہمسایہ ملکوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔'' کالے بادلوں میں چھپا سورج''، ''اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رگ'' اور اس قبیل کے کئی اور افسانے صرف افسانہ کے بطور پڑھنے یا پڑھ کر آج کے کشمیر کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی چیزیں نہیں ہیں، بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کی دُہائی دینے والی سچائیاں ہیں۔خالد حسین نے تو محض ان سچائیوں کو افسانوں کے جامے پہنائے ہیں۔ایسے افسانے ان سوالوں کا جواب بھی رکھتے ہیں کہ ''جنت'' کو ''گرہن'' کیوں لگا۔ایسا کیوں ہو گیا کہ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد سے ہی مستقل ''اٹوٹ انگ'' اور شہ رگ'' کے راگ الاپے جانے کے باوجود، نئی نسل کہتی ہے ''آؤ ہماری چھاتیوں کو گولیوں سے چھلنی کر دو۔ہمیں اندھا بنا دو۔سبب کیا ہے کہ ''بچے پتھروں کے بدلے گولیاں کھاتے ہیں لیکن بھاگتے نہیں۔''بندے ماترم'' اور ''نعرۂ تکبیر'' لگانے والے، کیوں 'لل ماں اور 'نند ریشی' کا آپسی بھائی چارے کا درس بھول گئے۔ایسے سوالوں کا جواب ہندوستان، پاکستان یا جموں کشمیر کی سیاسی یا مذہبی جماعتوں میں سے کسی کے پاس نہیں، خالد حسین یا کوئی اور سچا اور مخلص فنکار یا دانشور صرف ''احساس'' کی جوت ہی جلا سکتا

ہے۔خالد حسین نے ''ستی سر کا سوج'' کے بعد ''جنت گرہن'' کے افسانوں کے ذریعے بھی اسی کی کوشش کی ہے۔حالانکہ کشمیر میں آج بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی شمعیں کہیں نہ کہیں روشن نظر آ ہی جاتی ہیں

''قاضی گُنڈ کا برج ناتھ کول ۱۹۹۰ء. کی گڑ بڑ میں جموں چلا گیا تھا ۔اپنے بادام کے باغ ..اور کھیت اپنے ہمسایہ اور بچپن کے دوست غلام پنڈت کے حوالے کر گیا تھا۔غلام پنڈت ..کمائی کی رقم جموں جا کر برج ناتھ کول کو دے آتا ۔مجاہدوں کو غلام پنڈت کی شرافت اور ایمانداری آنکھوں میں چُبھنے لگی ،انہوں نے اس غریب کو مار ڈالا اور مکان جلا دیا۔ غلام پنڈت کی بیوہ اپنے دو بچوں کے ساتھ جلی ہوئی ..جھگی میں اپنی بدبختی پر روتی رہی ۔جب برج ناتھ کو پتہ چلا تو وہ قاضی گُنڈ آیا اور اپنی زمین میں سے پانچ کنال اراضی .غلام پنڈت کی بیوہ مہ جبین کے نام ہِبہ کر دیا اور رہنے کے لئے پُختہ مکان بنا کر دے دیا۔'' مہہ جبین اور اس کے بیٹے آج بھی برج ناتھ کول کی جائداد کی رکھوالی کرتے ہیں۔''

افسانہ ''مداوا''

''جنت گرہن'' کے افسانوں کے مطالعے سے ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ، خالد حسین کی شخصیت اور فن کا ایک روشن نقطہ ''تصوف'' بھی ہے۔انسانیت پر مبنی، وہ تصوف جو کسی بھی طرح کے مذہبی یا مسلکی اختلاف کو رد کر کے باہمی اتحاد اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ابتدا سے لے کر آج تک خالد حسین کے افسانوں میں ،لل ماں اور نُند ریشی کی تعلیمات کے طفیل، صوفیانہ سوچ اور فکر کی پرچھائیاں الگ الگ صورتوں میں ہر جگہ

رقصاں نظر آتی ہیں۔ جنت گرہن میں شامل افسانہ ’’مداوا‘‘ میں انہوں نے خود لکھا ہے،

’’میں ’لل ماں‘ اور ’نند رشی‘ کا مُرید، اکثر خوابوں میں ان سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ وہ اپنی جنت بے نظیر کو دوزخ کے شعلوں میں جلتے دیکھ کر بہت دکھی ہیں..انہوں نے مذہب اور ذات پات کے نام پر انسان کو بانٹنا کُفر سمجھا تھا۔ وہ حیران ہیں کہ لوگ سیدھے راستے پر چلتے چلتے کیسے الٹی ڈگر پر چل پڑے۔ مجھے دیوی ماں اور میرے مرشد نے سمجھایا کہ..میں پیار سمندر سوکھنے نہ دوں، مٹی کا موہ مٹنے نہ دوں اور رشتوں کی جڑیں کٹنے نہ دوں..انہوں نے مجھے میٹھی اور کڑوی روحوں سے بھری ایک پوٹلی دی اور کہا کہ نفرت، حسد اور بُخل والی روحوں اور شکر میں گھلی روحوں کو الگ الگ کروں اور ان کو نام نہاد مذہبی پیشواؤں اور سیاسی بن مانسوں سے بچاؤں اور سمجھاؤں کہ اپنی مٹی کو اتنا نہ کھودا جائے کہ زمین وقت سے پہلے بنجر ہو جائے‘‘

افسانہ۔مداوا

’’شریعت‘‘ کی پابندی کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن خالد حسین طریقت‘‘ میں بخالت کرتے ہوں اس کا بھی کوئی گواہ نہیں ملے گا۔ خالد حسین کی صحبت میں وقت گزارئے یا نہیں تو ’’ستی سر کا سورج‘‘ اور ’’جنت گرہن‘‘ میں شامل ’’زہرِ عشق‘‘ اور ’’ریشمن دھاگہ پریم کا‘‘ جیسے افسانوں کو ڈوب کر پڑھیے، بالائی طور پر یہ تو محسوس ہوگا ہی کہ خالد حسین کو بلھے شاہ ،شاہ حسین، بابا فرید اور گورونانک جیسے صوفیا کے کلام سے کتنا لگاؤ ہے، لیکن بین السطوران کے وُجد کے عالم تک پہنچئے تو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ تقاضائے بشری کے تحت، کاروبارِ جہاں

کے جدید ترین علائق اور رسومیات میں الجھایا گیا یہ شخص اور افسانہ نگار، خالد حسین غالباً! خود بھی ایک صوفی ہی ہے ویسا ہی جیسا کہ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد ،ظاہراً دنیا دار ہوتے ہوئے بھی صوفی منش شخص اور افسانہ نگار تھے۔ایسا نہ ہوتا تو خالد حسین افسانہ ''زہر عشق' کی شاداں بلی کی زبانی اتنی بڑی بات نہیں کہہ پاتے کہ،

''...قلندری رمزوں کو جب سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ انسانی قلبوت کے اندر ایک دنیا سمائی ہوتی ہے ہر صوفی اپنے قلبوت کے اندر کوٹھے اور حجرے بناتے رہتے ہیں۔جلال اور جمال والے صوفی ،راج،تاج اور سماج کی پرواہ نہیں کرتے،بس مولا سائیں کی درگاہ کے اندر تصوف کی ست رنگی 'مدھوشالہ میں مستی کی 'مدِرا پیتے رہتے ہیں۔نماز ،روزہ،ذکات اور پوجا پاٹھ سب ظاہری روپ ہیں ،لیکن ''ربی عشق ''صوفیوں کے 'انتر من' کو روشن کر دیتا ہے۔...درویشی اور فقیری سوئی کے سوراخ میں سے اونٹ نکالنے والی بات ہے۔اس کا علم مجھے صوفیوں کا کلام پڑھ کر ہوا۔''

افسانہ۔زہرِ عشق

خالد حسین کی افسانہ نگاری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے ہر افسانے میں ''سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی'' کی کیفیت ہوتی ہے۔اور کسی بھی اعلی اور عمدہ افسانے کی پہچان بھی یہی ہوتی ہے کہ اس کا 'درمیان'' 'ابتدا' اور 'انتہا' کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ابتدائیہ قاری کو ماضی کی طرف بہت دور تک لے جاتا ہے اور 'انتہا' یا 'اختتامیہ' مستقبل کی جانب۔ جنت گرہن کے افسانوں میں بھی ان کے ''درمیانئے'' افسانہ کی ابتدا اور انتہا سے جڑ کر

افسانوں کے فکری اور بصیرت خیز (Visionary) اثر انگیزی کو "غیر موجود بیانیوں" Unwritten Narrations کو بھی زندہ اور متحرک کردیتے ہیں۔ خالد حسین کی افسانہ نگاری کا منفرد اور شناختی امتیاز یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں "کہی" باتوں سے کہیں زیادہ "ان کہی" باتیں (اسٹیٹمینٹس) قاری کے اندر تک پہنچتی ہیں۔ اس ضمن میں خالد حسین کی جزیات نگاری اور تبصرے (Statements) ان کے 'محاورات، ترکیبات اور ضرب الامثال کے ساتھ مل کر افسانوں کی معنی خیزی اور اثر آفرینی کو 'بے کنار' کردیتے ہیں۔ خالد حسین کے ہر مجموعے سے اس کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں 'جنت گرہن' سے صرف چند ایک مثالیں دیکھئے،

"عشق ملنگی، پیار کی گاجنی، دل کی تختی، موہ کے حروف، عشق کی گنڈیریاں، دکھوں کی عمر قید، مغروری اور تکبّر کے سانپ، دُکھوں کی سُنامی، جبر کے آگے صبر، تڑپ کا دارو، آوارہ گردی کی جوتیاں، جسم کا نمک، چاولوں میں پتھر چُننے کی عمر، سچ کا ترازو، ترشولی گیت اور چاند تارے کے ترانے، "دوہا ہوا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا، پیڑ بیگانی مٹی میں جڑ نہیں پکڑتے، مالدار امیر اور بھوکے شریف سے ہمیشہ بچنا چاہئے، جن کے سُر میٹھے، ان کی سرداری بھی میٹھی ہوتی ہے، مسکین کا آنسو اور گشتی کا چپو پاتال کو ہلا دیتا ہے، جو سُکھ چھجو کے چوبارے، نہ بلخ نہ بخارے، وغیرہ وغیرہ،

دراصل ادبی تخلیق کا ایک مقصد زبان کے امکانات کی توسیع بھی ہوتا ہے۔ نت نئی تراکیب و اصطلاحات، محاورات اور ضرب الامثال، علائم و پیکر اور تشبیہات و استعارات وضع کرنے کا عمل اصلاً زبان کے اظہار و بیان، مضمون و معنی آفرینی کے امکانات کو روشن کرنے کا ہی عمل ہوتا ہے۔ اس سے جہاں زبان کے 'سرمایۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے

وہیں ادبی تخلیق کا اپنی مٹی، اپنی سماجی اور تہذیبی جڑوں سے رشتہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ خالد
یہ فریضہ بڑی خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ کام آسان بھی نہیں، عربی میں قدامہ
بن جعفر اور ابن رشیق نے، فارسی میں نظامی عروضی سمرقندی اور وطواط، سنسکرت میں آنند
وردھن اور رودرت نے اور اردو میں وحید الدین سلیم اور حالی وشبلی نے اور مغربی دانشوروں
میں سوسئیر، اور ڈریدا سے لے کر جولیا کرسٹیوا تک نے، اور خاص طور پر روسی ہئیت پسندوں'
(Formalists) میں شکلووسکی اور رومن جیکوبسن وغیرہ نے متن/ادبی تخلیق میں
سماج اور ثقافت سے جُڑے الفاظ وتراکیب کے برتاؤ اور اخذ معنی کے حوالے سے تفصیلی
بحثیں کی ہیں۔ ایسی ساری بحثوں کا خلاصہ یہی ہے کہ ''شعر ہو یا افسانہ کسی بھی متن/ادبی
تحریر میں استعمال کیا گیا کوئی بھی لفظ (ترکیب، اصطلاح، محاورہ، ضرب المثل
تشبیہہ، استعارہ، قول یا کہاوت) صرف 'مخلوق' نہیں، معنی مفہوم، کیفیت وتاثر کا خالق بھی
ہوتا ہے۔ اسی لئے اس ''تخلیقی رمز' سے آشنا ہر تخلیقی فنکار اپنی تخلیقی کائنات میں ایک منفرد
لسانی نظام (Linguistic System) کی تشکیل کرتا ہے۔ شاعری میں غالب، انیس
اور اقبال، کے یہاں اور افسانے میں قرۃ العین حیدر، کرشن چندر اور منٹو کے یہاں
انفرادیت اور عظمت کے جو روشن دائرے ملتے ہیں وہ اور باتوں کے علاوہ ان کے اپنے
اپنے منفرد اور مخصوص ''لسانی نظام'' کی وجہ سے بھی ہیں۔ خالد حسین کے فن (افسانہ نگاری)
کی بھی ایک نمایاں اور شناختی قوت ان کا اپنا مخصوص اور منفرد لسانی نظام بھی ہے۔ جو پنجابی
زبان کے بے کنار دریائی بہاؤ اور اردو زبان کی کُشادہ دلی کی آمیزش وآویزش کے سبب ''دو
آتشہ'' ہو جاتا ہے خالد حسین عام طور پر پیچیدہ بیانی سے پرہیز کرتے ہیں، ''جنت گرہن
میں شامل افسانے ''زندہ آنکھوں کی داستان''، ''کالے بادلوں میں چُھپا سورج'' اور ''ننگے

بھگت'' اور ''لاگا پگڑی میں داغ'' وغیرہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ خالد حسین علامتی، استعاراتی اور اساطیری افسانے لکھنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، لیکن خالد حسین سریندر پرکاش اور بلراج مینرا، احمد ہمیش، اور انور سجاد کے جدید افسانوں کی طرح انتہائی ذاتی نوعیت کی علامتوں کا استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کی علامتوں اور استعاروں کی جڑیں اپنے ماحول، معاشرہ کی تمدنی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی زمینوں میں پیوست ہوتی ہیں اسی لئے ان علامتوں اور استعاروں کی تہوں اور طرفوں کو کھول کر افسانہ کے معنی و مفہوم اور افسانہ نگار کی منشا کو گرفت میں لینے میں قاری کو دشواری نہیں ہوتی۔ اسی طرح خالد حسین کے بعض افسانوں، مثلاً ''عشق ملنگی، 'یادرفتہ، زندگی کے مارے لوگ'' وغیرہ میں، 'ماضی کی بازیافت، ، سماجی وسیاسی انتشار، تہذیبی واخلاقی زوال کے اسباب اور ان کے 'مداوا' کے لئے صوفیا کے ملفوضات اور فرمودات سے کسبِ فیض کا رجحان تو نمایاں ہے، لیکن یہ معاملہ انتظار حسین کی طرح محض اساطیری اسلوب میں کہانی بیان کرنے کا نہیں، بلکہ لل ماں اور نُند رشی کے مطابق، مذہب اور عقیدہ کے اختلافات سے اوپر اُٹھ کر زندگی اور زمانہ کی روح اور ضمیر میں، امن و آشتی اور محبت و اخوت کی مثبت اور تعمیری سوچ اور فکر کے چراغ رِوشن کرنے کا ہے۔ CORONA 19 نے پورے عالم انسانیت کے مقدر میں ''فنا'' لکھ دیا ہے ، لیکن اس سے بھی زیادہ ہلاکت خیز 'وبا' فرقہ واریت ہے جو ایک اور ''ہبوط آدم'' کی ایسی کیفیت پیدا کررہی ہے کہ پھر شاید 'پاتال' میں بھی پناہ نہ ملے۔ اسی لئے خالد حسین کے افسانوں میں عصری حقائق اور مسائل کے پسِ پُشت ایک ''نئی دنیا کا خواب'' بھی نظر آتا ہے جو نہ جانے کب سچ ثابت ہو جائے....

''ربُ العِزت نے ایک نئی کائنات سجائی۔ دوبارہ خاک سے آدمؑ اور

حوّا کو پیدا کیا۔.......پھر آدم کو حکم دیا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اس کی کائنات میں دخل نہ دے ۔ اور جو مذہب، ذات پات رنگ نسل کی شناخت کو یکسر رد کر دے۔ سِر شٹی، کو ایشور کی 'لیلا' مانے اور صرف خدا کی خدائی کا وِرد کرے۔"

افسانہ: نئی دنیا کا خواب

چاند گرہن میں ایسے افسانے بھی ہیں جن میں خالد حسین نے استعاراتی اسلوب میں یہ بتایا ہے کہ "سیاسی ڈسکورس کس طرح زندگی اور ادب میں غالب محرک DOMINANTFACTOR کی حیثیت اختیار کر کے سماجی وتہذیبی، اور مذہبی تصور یا (لل ماں اور سُندر ریشی کی) آئیڈیالوجی کو لہولہان (Subvert) کرتا ہے،

"....پوری گھاٹی جوالہ مُکھی بن گئی ہے، جس میں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں... ہر طرف راکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور اس راکھ سے اُگی نئی نسل نے خود کو مرنے مارنے کے لئے تیار کر لیا ہے ... یاجوج اور ماجوج کی قوم کے جانشین ان حالات کے لئے ایک دوسرے کو دوشی ٹھہراتے ہیں... لیکن عوامی غصے کو ٹھنڈا کرنے اور مسئلے کا حل نکالنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے، بلکہ ترشولی گیت اور چاند تارے کے ترانے بجانے لگ جاتے ہیں۔ 'شبھ رگ' اور 'اٹوٹ انگ' کے پھیکے رنگوں کو 'بندے ماترم' اور 'نعرۂ تکبیر' سے اور گہرا کرنے کی کوشش میں جُٹ جاتے ہیں۔"

افسانہ۔ کالے بادلوں میں چھپا سورج

خالد حسین کے یہاں "زندگی کے مارے لوگ" جیسے افسانے بھی ہیں جن میں "

راوی'' خود' حاضر' ہو کر اپنے افسانے کی نوعیت کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔

''یہ کہانی لکھنے سے پہلے میں بڑا پریشان تھا تھا کہ اس کا آغاز کہاں سے اور کیسے کروں؟ کافی دیر تک میں اسی مخمصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا رہا ۔ پھر سوچا کہ اتنی مغز ماری کرنے کی کیا ضرورت ہے، چلو سیدھا کہانی لکھنی شروع کرتا ہوں''

افسانہ۔زندگی کے مارے لوگ

اس سے قبل خالد حسین نے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل افسانہ ''کھوکھلا سورج'' میں ہی اپنے تخلیقی طریق کار یا تکنیک کی وضاحت کردی تھی۔

''میں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں پیوندکاری میں ماہر ہوں....آپ میرا یقین کریں، یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی، ایک کہانی ،کئی ٹکڑے، چھوٹے بڑے، غیر ضروری ٹکڑے''۔

افسانہ۔کھوکھلا سورج۔اشتہاروں والی حویلی

خالد حسین کا اپنے فن (افسانہ نگاری) سے متعلق یہ واضح نظریہ اور اعتماد ان کے ابتدائی افسانوں سے لے کر 'جنت گرہن'' تک کے افسانوں میں ملتا ہے۔خالد حسین کا یہ 'تخلیقی رویہ' جدید اور مابعد جدید افسانوں میں بھی ملتا ہے، سریندر پرکاش کے ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' اقبال مجید کے ''دو بھیگے ہوئے لوگ، اور ظفر اوگانوی کے ''بیچ کا ورق'' میں بھی کہانی ٹکڑوں میں ہی بیان ہوئی ہے۔لیکن خالد حسین کے افسانوں کے ٹکڑوں میں انتشار نہیں ربط اور انضمام (Merger) کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔دراصل مرکزی موضوع، فکر یا آئیڈیالوجی یعنی افسانوی ''جوہر'' Story Essence مضبوط اور تاثر خیز ہو تو اس

موضوع فکر وخیال یا آئیڈیالوجی کی قوت، سبھی بنیادی یا حاشیائی ٹکڑوں کو جوڑ کر افسانہ/کہانی کی ایک ساخت واضح کر دیتی ہے، یوں بھی خالد حسین کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ''بیانیہ'' بھی 'کثیر الجہات' (Hetrodiegtic) ہوتا ہے۔

''جنت گرہن'' میں خالد حسین نے ''جاگتے ضمیر کی آواز'' کے عنوان سے تبرکاً ایک منی افسانہ / افسانچہ بھی شامل کیا ہے۔ جو گرچہ چند سطروں پر مشتمل ہے لیکن Content اور عصری معنویت کے اعتبار سے، منٹو کے 'سیاہ حاشئے' کی منی کہانیوں کی طرح ''دیکھن میں چھوٹو لگے، گھاؤ کرے گمبھیر'' کی کیفیت کا حامل ہے۔ جنت گرہن کے افسانوں میں بھی خالد حسین واقعہ، کردار، مرکزی خیال اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ہئیت، تکنیک اور اسلوب اختیار کرنے پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ اردو افسانہ میں ضرورت کے مطابق اسلوب بیان میں ردو بدل کرتے رہنے کی پانچ روائتیں نمایاں ہیں، پریم چند کی، منٹو کی، بیدی کی، کرشن چندر کی اور قرۃ العین حیدر کی روایت۔ ان سے آگے جوگندر پال کے بعد خالد حسین ہی ہیں جو افسانہ کے اسلوب بیان میں لگاتار نِت نئے اضافے کر رہے ہیں، بلکہ افسانہ ''ننگے بھگت'' کی پوری لسانی ساخت، اردو کی بجائے ہندی الفاظ وتراکیب سے تشکیل دی گئی ہے۔

غرض یہ کہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں، اشتہاروں والی حویلی، اور ستی سر کا سورج کے بعد ''جنت گرہن'' کے افسانوں کے حوالے سے خالد حسین کی افسانہ نگاری کے بارے میں جو ایک پختہ اور مستحکم تنقیدی نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہی ہے خالد حسین ایک ایسے مشاق، منفرد اور معتبر افسانہ نگار ہیں جو افسانہ نگاری کی تمام تر روایات، رجحانات، اور رسومیات کا احترام کرتے ہوئے، ہئیتی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی ہر اعتبار سے افسانہ کی ایک نئی ''بوطیقا'' کی

تشکیل کرر ہے ہیں۔ ایسی بوطیقا جو افسانہ کی شکل میں، مثبت اور تعمیری ذہن اور ضمیر کی قوت سے صرف جنتِ بے نظیر کو ہی نہیں، پورے عالم انسانیت کو ہر طرح کے 'گرہن' سے نجات دلانے کی ضامن ہو سکتی ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید

سابق صدر شعبہ اردو

ا۔ کشمیر یونیورسیٹی۔ سرینگر کشمیر۔

۲۔ سینٹرل یونیورسیٹی۔ کشمیر۔

۳۔ ایمیریٹس فیلو۔ جموں یونیورسیٹی

رابطہ نمبر:9419010472

کہانیاں من لُبھانیاں

خالد حسین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ پہلی، اُس کی کہانیوں میں کہانی پن کا مضبوط اظہار اور دوسری، اُسکی زبان کی خوبصورتی۔ افسانے کے بارے میں وہ خود کہتا ہے کہ وہ تخلیق جسے افسانہ کہتے ہیں، صرف افسانہ نہیں ہوتا بلکہ اپنی زمین، سماج اور زندگی سے کشید کیا ہوا ایک تخلیقی سچ ہوتا ہے، جس میں فنکاری (Craftsmanship) اور لفظوں کی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنے کلچر کی بھی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ جب میں نے خالد حسین کا یہ کتھن پڑھا تو مجھے مغربی ادیب اور دانشور ٹام کلینسی کی بات درست لگی کہ ''افسانے اور حقیقت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ افسانے کی تہہ میں کوئی مثبت بات یا اشارہ ضرور ہونا چاہیئے اور یہ کہ زندگی بے تکی ہوسکتی ہے لیکن افسانہ بے تکا نہیں ہوسکتا''۔ خالد حسین نے اپنے افسانوں میں جو محاوری زبان استعمال کی ہے، اُس کی مثال دوسرے افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں جو پیراڈائم (paradim) اُبھرتا ہے، اُس میں سیاسی وسماجی مسائل کے ساتھ مکالمہ (dialogue) کرتے افسانوں میں پولی میکس (Polemics) یا دلیل، اور زبان وبیان کی انفرادیت قاری کا دھیان اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نسوانی کرداروں والی کہانیاں پڑھیئے تو موپساں اور منٹو کا گمان ہوتا ہے۔ تقسیم ہند سے جڑی کہانیوں میں پیش کاری کمال کی ہے۔ سماجی تانے بانے اور انسانی قدروں سے جڑی کہانیاں قابل تعریف ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''میں اور میری تخلیق''، میں خالد حسین لکھتے ہیں۔

''جب میں نیا نیا ادبی اکھاڑے میں اُترا تو رُستم پہلوانوں نے مجھے اپنے اپنے داؤ پیچ

سکھانے شروع کئے۔شولوخوف نے کہا کہ اگر تم عام لوگوں کے اکھاڑے میں کُشتی لڑو گے ۔اُن جیسا لنگوٹ پہنو گے۔اُنکے جیون کو سمجھو گے۔اُن کے دُکھ سُکھ کو پہچانو گے تو لوگ تمہیں خالد حسین پٹھا شولوخوف کہیں گے۔تمہاری تخلیق عام لوگوں کے دِلوں کو جھنجھوڑے گی۔جیمز لِن نے کہا کہ کہانی کِسی ایک کردار،ایک واقع یا جذبے کو پیش کرنے کا نام ہے۔لارنس نے کہا کہ ایسے افسانے لِکھو،جن کو پڑھ کر قارئین کے جِنسی جذبے کو سکُون ملے۔فرائڈ نے کہا کہ افسانے میں نفسیات اور جنسیات کی باتیں کرو۔مارکس نے اقتصادی پہلوؤں پر قابو پانے اور معاشرتی مسئلوں کو سُلجھانے کے لئے کہا۔ساتر،خلیل جبران،پُشکن ،چیخوف ،رسُول حمزہ توف ،او ہنری،سومرسٹ مام، موپساں،پریم چند،راجندر سنگھ بیدی ،بلونت سنگھ ، کرشن چندر اور منٹو نے بھی بڑی مغز ماری کی لیکن میرے مُرشد بُلھے شاہ نے مجھے پڑھایا تھا کہ

عِلموں بس کریں او یار　　　　اِکو الف تیرے درکار

بس پھر میں نے 'الف' سے آگے کُچھ نہیں پڑھا کیونکہ یہ الف جب کسی تخلیق کا حِصہ بنتا ہے تو ذہن و دِل معطر ہو جاتے ہیں اور رُوح سیراب ہو جاتی ہے"۔

"ستی سر کا سورج"، "عشِق ملنگی" اور "جنت گرہن" کی کہانیاں پڑھتے ہوئے خالد حسین کی باتیں حقیقت لگتی ہیں۔اُس نے اپنے وقت کی بات کی ہے۔اُسکی کہانیوں کے پلاٹ اُسی زمین سے نِکلتے ہیں ،جس میں وہ رہ رہا ہے ۔خالد حسین نے اپنے بیانیے اور منفرد اسلوب سے اپنی شناخت بنائی ہے۔جس کے لئے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

(ڈاکٹر) منموہن

پنجابی نقاد،ناول نگار اور شاعر

دوارکا۔نئی دہلی

عشق ملنگی

لاہور میں داتا دربار کے سامنے پٹری پر چند عورتیں اور مرد چھوٹے چھوٹے پنجروں میں طوطے اور چڑیوں کو لئے گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اکثر عقیدت مند داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دینے کے بعد اُن کے پاس آتے ہیں اور پرندوں کی قیمت چُکا کر چڑیوں اور طوطوں کو پنجروں سے آزاد کراتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے اپنا یار گاما نائی یاد آ گیا، جس کی دُکان جموں کے اُردو بازار میں تھی اور دُکان کی چھت پر اُس نے ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ اُس چڑیا گھر میں گامے نائی نے چڑیوں اور طوطوں کے علاوہ کبوتر اور بندر بھی پال رکھے تھے۔ وہ بال کاٹنے کے ساتھ ساتھ طوطوں اور بندروں کو سِدھارنے اور اُنھیں کرتب سِکھانے میں بھی ماہر تھا۔ کئی مداری والے اُس سے بندر خرید کر لے جاتے اور اپنی روزی روٹی کماتے۔ ایک بندر گامی نے ایسا سدھایا تھا کہ بال کاٹتے یا حجامت بناتے ہوئے بھی وہ اُس کے شانوں پر چڑھا رہتا۔ گامی چرس والے سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ وہ چرس والے سگریٹوں کا دُھواں بندر کے نتھنوں میں ڈالتا اور یوں اُسکے ساتھ دِل لگی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے پالتو بندر کو سگریٹ کا ایک آدھ کش بھی لگوا دیتا۔ اس طرح دھیرے دھیرے گامی چرسی کا بندر چرس کے دھوئیں کا عادی ہو گیا، اور وہ اس نشے کی خماری میں مست رہتا۔ دو تین بندروں کی تربیت گامے نائی نے اِس عُمدگی سے کی تھی کہ جو بھی اُنھیں خرید کر لے جاتا، وہ بعد میں پچھتاتا کیونکہ آٹھ دس دِنوں کے بعد وہ بندر اپنے مالک کو چھوڑ، واپس گامی کے پاس آجاتے۔ گامی نے اپنے

پالتو بندر کا نام لٹّو رکھا ہوا تھا۔لٹّو گامی کی سِکھلائی ہوئی فنکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ کئی بار ساتھ والی دُکانوں کے اندر چلا جاتا اور دُکاندار سے نظر بچا کر چوّنی ،اٹھنّی اور روپے کا سکّہ مونہہ میں ڈال لیتا اور دوچار چھلانگیں مارتا ہوا پھر اپنی دُکان پر آجاتا، اور پیسے گامی کو دے دیتا۔ گامانائی پیسے جیب میں ڈال لیتا اور یوں یہ موج میلہ لگا رہتا۔ ایک بار گامی دوروز کے لئے کسی رشتے دار کی شادی پر جگانُو گاوٗں چلا گیا اور دوکان اپنے شاگرد اور لٹّو کے حوالے کر گیا۔ دودن چرس کے سگریٹوں کا دھواں نہ ملنے کی وجہ سے لٹّو کا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور وہ نڈھال ہو کر دُکان کے ایک کونے میں مریل سا پڑا تھا ۔گامی کے واپس آتے ہی وہ کُود کر اُسکی گود میں بیٹھ گیا اور اُسکے جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ گامی ساری بات سمجھ گیا۔ اُس نے چرس بھرا سگریٹ سُلگایا اور دُھواں لٹّو کے مُونہہ پر پھینکنے لگا۔ دُھواں سونگھنے سے اُسے ہوش آنے لگا۔ گامی نے سگریٹ کے پانچ سات لمبے لمبے کش لئے اور دُھواں لٹّو کے نتھنوں میں ڈالنے لگا۔ دُھواں اندر جاتے ہی لٹّو چُست اور دُرست ہو گیا۔

گامے نائی کا ایک جگری دوست تھا، جس کا نام کالے خان تھا۔ وہ صرف نام کا کالے خان تھا ورنہ وہ تو گوراچِٹا، لمبا اور خوبصورت پٹھان تھا۔ وہ ایک کوچوان تھا اور اُسکے پاس اپنا ٹانگہ گھوڑا تھا۔ وہ گمٹ اڈے سے اور کبھی پنج تیرتھی سے سواریوں کو لیکر نہر یا ستواری کے تین چار پھیرے لگاتا اور پھر گامی کی دُکان پر آجاتا۔ اپنا ٹانگہ اور گھوڑا وہ کبھی محلّہ تالاب کھٹیکاں میں وزیرِ وزارت سردار اکرم خان دُرانی کی حویلی کے پاس یا پھر محلّہ جیون شاہ والے چوک میں کھڑا کر دیتا اور گھوڑے کے آگے چارے والا تھیلا رکھ کر خود گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ جاتا۔ وہ گامی کی دُکان پر گپیں مارنے کم ،اور زیادہ آنکھیں سینکنے کیلئے بیٹھتا تھا

کیونکہ فیروزہ کسبی کا چوبارہ گامی کی دکان کے بالکل سامنے تھا اور کالے خان فیروزہ کا عاشق تھا۔ وہ اُس کے ساتھ نظر بازی کرتا رہتا۔ کالے خان یوں تو ایک سیدھا سادھا انسان تھا لیکن اُسکی آنکھوں میں فیروزہ کو حاصل کرنے کے سپنے ناچتے رہتے۔ میں بھی دفتر سے فارغ ہوتے ہی گامی کی دُکان پر آجاتا اور ہم دونوں کالے خان کا مذاق اُڑاتے رہتے۔

اُردو بازار سن سنتالی سے پہلے بڑا رونق والا بازار تھا۔ یہاں کسبیّوں اور ڈیرے دارنیوں کے چوبارے تھے اور چوباروں کے نیچے پھولوں، عطر، پان، سگریٹ، چائے، دودھ دہی، مٹھائی اور نہاری کی دُکانیں تھیں۔ شیشے، کنگھے، پراندے، چُوڑیاں، کنگن ، جھمکے اور چھلّے کی چھابڑیاں تھیں۔ برف، کُلفی، شربت، سوڈا اور نمبو پانی کی ریڑھیاں تھیں ۔ افیم، چرس، گانجا اور شراب بے حساب دستیاب تھی۔ اس بازار میں ملکہ پُکھراج، اُسکی پھوپھیاں نیلو اور فیلو، ماموں زاد بہن زبیدہ، بھاگو پیرنی کی بیٹی گوہر جان، اقبال بالی، تاجی، زُمّرد، سردار بیگم اور موتی جان اپنے حُسن کے جلوے لُٹاتیں اور موج مستی کے شوقین نوجوانوں، خصاب رنگے اور مہندی رتے عاشقوں کی جیبیں ہلکی کراتیں۔ گانے بجانے کی محفلیں رت جگا کرتیں۔ موتیے، گلاب اور مُول سری کے پھولوں کی خشبوئیں دِل رُبائی کرتیں۔ الھڑ جوانیوں اور سُریلی آوازوں کا سنگم قیامت ڈھاتا اور من چلے فرشتوں کو ترساتا۔

یہ شاید سن چالیس کی بات ہے کہ پٹیالہ گھرانے کے مشہور گائیک اور کلاسیکی سنگیت کے ماہر خان صاحب اُستاد عاشق علی خان پٹیالے سے جموں آئے تھے۔ اُنہوں نے ریذیڈنسی روڈ پر بنی کشمیر سوپ فیکٹری کی چھت پر گیت سنگیت کی محفل میں شرکت کی اور اپنی گائیکی

کا کمال دکھایا۔ اُستاد عاشق علی خان صاحب کو سننے کیلئے ملکہ پکھراج، گوہر جان، سردار بیگم اور موتی جان بھی آئیں تھیں ۔گوہر جان اور سردار بیگم نے تو از راہِ عقیدت خان صاحب کے پاؤں بھی دبائے تھے۔وہاں کسی نے خانصاحب سے فرمائش کی کہ وہ کُندن لال سہگل کی راگ گندھاری میں گائی ہوئی ٹھمری ،''جھولنا جھلا وَ ری ،انبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے ''سُنائیں ۔خان صاحب ہلکا سامُسکرائے اور پھر اُنہوں نے گندھاری شروع کی اور اپنی آواز سے محفل کو مست بنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ گندھاری کا اصل روپ کیا ہے اور پٹیالہ گھرانے کی لے کاری کسے کہتے ہیں۔ پھر اُنہوں نے ایک دادرا سُنایا۔بول تھے۔''کہاں بِگری رے مورے ماتھے کی بندیا۔''محفل ختم ہوئی ۔خان صاحب کی عزّت افزائی کی گئی ۔انعام واکرام سے نوازا گیا۔شال دوشالے پیش کئے گئے اور کئی رئیس گھرانوں میں اُن کی دعوتیں بھی ہوئیں۔ ملکہ پکھراج نے اُن کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی اور پھر سنگیت کی دُنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔

پر کالے خان کو نہ تو سنگیت کی محفلوں میں بیٹھنے کا شوق تھا اور نہ ہی کسبیّوں سنگ رباب بجانے کا چاؤ۔ وہ تو صرف فیروزہ کا الغوزہ تھا۔فیروزہ کیلئے اُس کی محبت ایک نُوری کلمہ تھی۔رُوح کا ساز تھی اور دِل کی آواز۔وہ فیروزہ کے سر پر عزّت کی چادر ڈالنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا تھا اور اپنی ذات کو اُس کے وجود میں گُم کرنا چاہتا تھا۔جبھی تو وہ گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ کر اپنی آنکھوں کو فیروزہ کے چوبارے کا طواف کراتا رہتا اور ہلکی سُر میں ماہیئے گاتا رہتا۔

ویسے تو کالے خان کورا ان پڑھ تھا مگر عشق کتاب کے الفاظ اُس کے دِل نے خوب پڑھے

تھے اُس بیچارے کی خواہش تھی کہ فیروزہ پیار کی گاجنی سے اُس کے دِل کی تختی کو لیپ دے اور موہ کے حروف لکھے اور اُس کی رُوح کو سکون بخشے۔ فیروزہ کیلئے اُس نے اپنی آنکھوں میں شرم وحیا کا سُرمہ ڈالے رکھا اور من کے گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑے رکھی اور اُسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ کالے خان فیروزہ کے حُسن کا شیدائی تھا اور کہتا تھا کہ اللہ میاں نے عاشق کو عِشق اور معشوق کو حُسن کی دولت سے نوازا ہے، جب دونوں ایک ہوجائیں تو ''کچے گھڑے'' بھی پار لگ جاتے ہیں۔ فیروزہ کو دیکھتے ہی کالے خان کے من موسم میں سرسوں پھُوٹ پڑتی اور دِل باغ و بہار ہوجاتا۔ وہ من ہی من میں فیروزہ کو پیار پیپل پر جھُولا جھولاتا اور گاتا، ''پینگ چُوٹیندے دو جنے نی اویے'۔۔ عاشق تے معشوق وے ماہیا''۔ پردیے کا نام لینے سے بھلا اندھیرا بھی دُور ہوا ہے کبھی۔ اُس کے لئے تو چراغ جلانا پڑتا ہے جو ابھی تک جلا نہیں تھا۔ کالے خان گامی کی دُکان پر بیٹھ کر فیروزہ کے دِید کی عید مناتا مگر بات کرنے سے ڈرتا تھا۔ گامی جانتا تھا کہ جب سے کالے خان نے فیروزہ کے ساتھ آنکھ لگائی ہے تب سے اُس کی آنکھ نہیں لگی اور وہ گُم سُم سا رہنے لگا ہے لیکن وہ کالے خان کو کچھ نہیں کہتا۔ صِرف عِشق نظارا دیکھتا رہتا۔ آہستہ آہستہ فیروزہ کو پتہ چل گیا کہ کالے خان نام کا کوئی کوچوان گامے نائی کی دُکان پر بیٹھ کر اُسے تاکتا رہتا ہے۔ ایک دِن اُس نے گامے کو اپنے چوبارے پر بُلایا اور کالے خان کے بارے میں پُوچھ گچھ کی۔ جب گامی نے بتایا کہ کالے خان ایک سیدھا سادہ بندہ ہے اور اپنے دِل کی سُرمے دانی سے اُس کے نینوں میں عشق کا سُرمہ ڈالنا چاہتا ہے اور اُسے اپنا بنانا چاہتا ہے تو فیروزہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ وہ غُصّے سے لال پیلی ہوگئی اور پھُنکارنے لگی۔

''وہ کمینہ اور گھٹیا کوچوان مجھے حاصل کرنے کے سپنے لے رہا ہے۔ ذات کا کوڑھ کِرلا اور شہتیری کو جھپٹے۔ بس اس بات کو یہیں ختم کردو۔ کسی اور کے ساتھ بکواس مت کرنا۔ میرے چوبارے پر رئیس زادے اور وڈیرے آتے ہیں اور دولت لُٹاتے ہیں۔ وہ ٹانگے والا مجھے کیا دے گا۔ اُس کی اوقات ہی کیا ہے۔ اُسے سمجھا دے کہ وہ میرے خواب دیکھنے چھوڑ دے اور یہاں سے دفع ہوجائے ورنہ غنڈوں سے اتنا پٹواؤں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے''۔ فیروزہ کی باتیں سُن کر گامی نے کہا تھا

''فیروزہ بی بی! کالے خان تمہارا سچا عاشق ہے۔ وہ تُمہیں دِل کی دولت دے سکتا ہے۔ جان تمہارے نام کرسکتا ہے۔ اُس کا عشق اذان کی طرح پاک ہے۔ اُسے تمہارے حُسن نے ٹھگ لیا ہے۔ اُسے تمہیں دیکھنے کا چسکا لگ گیا ہے۔ وہ تڑپ رہا ہے اُس کی زندگی خاک میں نہ ملا، ورنہ اُس کے دِل کی دہلیز کو دیمک کھا جائے گی اور آنکھوں کا کوٹھا ٹپک پڑے گا۔ وہ سرد، گرم موسم میں تمہارا ساتھ دے گا۔ فیروزہ بی بی! جوبن کے دن چار، پھر نہیں ملتے یار، اور جب تن طنبورے کی تاریں ڈھیلی ہوجائیں تو عمر کی سانسی اُنہیں کس نہیں سکتی۔ مگر کالے خان تیز دوپہر میں تمہاری گھنی چھاؤں بنے گا اور ڈھلتی شام میں تمہارا سہارا۔ بی بی! رُوپ سرُوپ کی مایا کا مان نہ کر۔ یہ سب چھّل فریب ہے، مگر اُس کا عِشق امبری سیب ہے۔ میٹھا اور جھرنے کی طرح پاک وصاف۔ فیروزہ! تمہاری دُنیا جھوٹ ہے، اُس کی دُنیا سچ۔ اور جھوٹ سے بڑا چھّل کوئی نہیں جبکہ سچ سے میٹھا پھل کوئی نہیں۔ یہ رئیس زادے اور وڈیرے جسموں کے بھُوکے ہوتے ہیں پر کالے خان تمہاری رُوح کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔ اسلئے یہ بے رُخی چھوڑ۔ حُسن کا گمان نہ کر۔ یہ مٹی میں مل

جاتا ہے باقی صرف اللہ کا نام رہتا ہے''۔

''گامی! مجھے لفظوں کے جال میں نہ پھنسا۔ لفظ کاغذوں پر ناچتے اچھے لگتے ہیں۔ زندگی کی کسوٹی پر ان کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ عشق، پیار، محبت کی باتیں کرنا ہوس پرست مردوں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ تم یہ سانگ رچانے چھوڑو اور نکلو یہاں سے''۔ وہ اُلٹا سیدھا بولتی رہی۔ گامی سُنتا رہا۔ اُس کی کوئی دلیل قبول نہیں ہوئی۔ آخر وہ ہار کر فیروزہ کے چوبارے کی سیڑھیاں اُتر آیا۔ کچھ دیر بعد کالے خان بھی دُکان پر آ گیا۔ گامی نے اُسے فیروزہ کے ساتھ ہوئی ساری گفتگو سُنائی اور سمجھانے لگا۔ ''کالے خان! تم میری دُکان پر بیٹھ کر فیروزہ کو تاکنا چھوڑ دو۔ وہ بڑی خبیث عورت ہے۔ تمہاری شکل سے بھی بے زار۔ وہ تمہیں غنڈوں سے پٹوانا چاہتی ہے۔ وہ آگ اُگل رہی تھی۔ اور باؤلی کُتیا کی طرح مجھ پر غرا رہی تھی۔ اس لئے فیروزہ کا خیال چھوڑ دے۔ تم نہیں جانتے کہ رنڈی کا شور خرابہ اچھا نہیں ہوتا۔ تمہیں فیروزہ کے سر پر عزّت کی چادر سجانے کا شوق چڑھا ہے لیکن یہاں اُردو بازار کے چوباروں کی ریت نرالی ہے۔ یہاں دوشیزائیں سرننگی رہتی ہیں مگر سرنگی کو غلاف چڑھاتی ہیں تاکہ ساز آباد رہیں''۔

گامے نائی کی باتیں کالے خان کے پلے نہیں پڑیں۔ اُس نے اب ٹانگے کے پھیرے لگانے بھی کم کر دیئے تھے اور سارا سارا دن گامی کی دُکان پر بیٹھا رہتا اور فیروزہ کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہتا تاکہ یار کے دیدار ہوں۔ دکان بند ہونے کے بعد بھی وہ چبوترے پر بیٹھا رہتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ گاؤں شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی جاگ اُٹھتے ہیں مگر شہر رات کو جاگتے ہیں اور دن میں سوتے ہیں۔ خاص

کر جموں کے اُردو بازار باسی۔ اس لئے جب تک اُردو بازار جاگتا۔ کالے خان بھی جاگتا رہتا اور سحری کے وقت گھر جاتا۔ دکانیں کھلتے ہی وہ پھر بازار میں آجاتا۔

عشقِ بلائے جان نے اُس کی نیندیں چُرالی تھیں۔ جلد ہی کالے خان کی یہ پریم کہانی محاوروں کی طرح مشہور ہوگئی۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ اُس کے یار دوست اُسے سمجھانے لگے۔

''کالے خان! تمہاری کرتوت کا سُن کر میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔ میرے یار! یہ کون سے کیچڑ میں دھنس گئے ہو۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ اوئے پاگل! کنجری کو دِل دے بیٹھے ہو۔ یہ کیا کر بیٹھے ہو۔ تُو نے کس بلاؑ پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہاں جموں میں بھلا لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت۔ تم جِس مُٹیار پر اُنگلی رکھتے، اُسی کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھوا دیتے''۔ سلیم پانڈی بول رہا تھا۔ ابھی اُس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ رشِید اقصائی کہنے لگا۔

''تمہیں یہ کون سا عِشق کا جِن چمٹ گیا کہ تم نے ٹانگہ گھوڑا کرایے پر دے دیا اور خود فیروزہ کے چولہے کی راکھ چھان رہے ہو۔ شرم کر شرم۔ اِن کوٹھے والیوں کے چکروں میں نہ پڑ۔ کیوں اِس موہ کی بھُوک کو پال رہے ہو۔ یہ بھُوک پالنے لائق نہیں ہے۔ کیوں ٹوٹ پھُوٹ کا شکار ہوئے ہو۔ ہوش کرو۔ عقل کو ناخن نہ مارو اور دِل کے تار گُھر چنے بند کردو۔ خواہشوں کی بستی میں صرف اندھیرا ہوتا ہے۔ اس لئے چاہتوں کی گھڑولی پھوڑ اور اُس کا خیال چھوڑ۔ حوصلہ کر اور ٹانگہ پکڑ۔ ہم آج ہی تیرے لئے رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔ تیری شادی کراتے ہیں۔ اپنی گھر ہستی بنا اور موج منا''۔

''رشِید ے یار! فیروزہ کیلئے میرے من کا پنچھی پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ پر تُم لوگ عِشق کی رمز کو

کیا سمجھو۔ یہ جو زندگی ہے نا، یہ ایک سوئی ہے، اور اس سوئی میں عِشق کا دھاگہ کوئی سوچ سمجھ کر نہیں پروتا۔ دوسری بات یہ ہے شِیدے! کہ عِشق مانگنے سے نہیں ملتا۔ یہ تو روحوں پر نازل ہوتا ہے ۔اور میری روح بھی فیروزہ کے دِل دروازے پر دستک دے رہی ہے ۔آگے میری قسمت ۔اگر میری تقدیر میں ہجر سزائیں ہیں تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے درد کا بوجھ خود برداشت کرنا ہے۔ پھر تمہیں تو پتہ ہوگا کہ عِشق کی منزل کو جانے والے راستے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ان راہوں پر چلنے والا ایک راہی اگر چلا جاتا ہے تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔۔ مجنوں، فرہاد، پُنوں، مہینوال، مرزا اور رانجھا سبھی اِسی راہ کے راہی تھے۔ میں بھی اِس راستے پر چل پڑا ہوں۔ آگے میرا مقدر۔ تم میری فکر مت کرو۔وہی ہوگا جو منظورِ خُدا ہوگا''۔

ایک دن جب کالے خان کی چاہت مونہہ زور ہوئی تو اُس نے فیروزہ کے چوبارے پر حاضری دینے کی ٹھان لی۔ وہ گامے نائی کی دکان سے نیچے اُترا، سڑک پار کی اور چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''تم! تم کیا لینے آئے ہو یہاں''؟ فیروزہ گرجی۔

''میں اپنے دِل کے کہنے پر تم سے پیار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اپنی محبت کا شربت پلا۔ تجھے بسم اللہ کا ثواب ملے گا۔ فیروزہ! میری دِل کی کُٹیا میں بڑی سیلن ہے تو موہ کی اگنی بال تاکہ میں ہو جاؤں نہال۔''۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ تجھے گامے نائی نے نہیں سمجھایا۔ تیری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے۔ کیوں مرنے کیلئے یہاں آئے ہو۔ سُور کے بچے۔۔ تمہیں اتنی مار پڑے گی کہ اپنے

پاؤں پر چلنے کے قابل نہیں رہو گے۔ یہ عشقِ مُشق کے چونچلے چھوڑ اور دفع ہو جا یہاں سے۔ساری مرد ذات کام کا کیڑا ہوتی ہے۔اِن کا پریم دکھاوا۔دھرم دکھاوا۔کرم دکھاوا۔یہ باہر سے پیار کی قسمیں کھاتے ہیں مگر اندر سُلگے کام کا لاوا۔میں مردوں کے سارے لچھّن سمجھتی ہوں۔''۔

''فیروزہ! تم چاہے مجھے غنڈوں سے پٹواؤ، چیلوں اور گِدھوں کو میرا ماس کھلاؤ۔کُتوں کو میری ہڈیاں ڈالو۔میں پھر بھی زندہ رہوں گا۔میری کتھا کہانی جگ میں امر گیت بنے گی کیونکہ میرا عشق میرا جُنون ہے۔اور جُنون کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔فیروزہ! تمہارے بازار میں کوڑیوں کے بھاؤ قہقہے بِکتے ہیں۔آنکھوں کے اِشارے بِکتے ہیں۔شریر کے نظارے بِکتے ہیں۔تم بھی تو جسم بیچتی ہو۔پر میں خریدار نہیں۔اگر میں کام کا روگی ہوتا تو تیرا بھوگی ہوتا۔لیکن میں تو تمہارے ساتھ نکاح کے کلمے پڑھنا چاہتا تھا اور تمہیں اپنانا چاہتا تھا مگر تم تو بے حیائی کا چولا اُتارنا ہی نہیں چاہتی۔یاد رکھو کہ سدا باغوں میں بلبلیں نہیں بولا کرتیں اور نہ ہی سدا باغ بہاریں رہتی ہیں۔ یہ حُسن ،جوانی ،یاروں کی دلداریاں ، سب مکّاریاں ہیں۔میری بات پلے باندھ لے کہ ایک وقت آئے گا جب تمہارا درد بانٹنے والا کوئی نہیں ہوگا۔اُس وقت میرا عِشق تمہارا سہارا بنے گا۔اسلئے فضول تماشے کرنے چھوڑ دو۔آنکھ میلی نہ کرو اور میرا ہاتھ تھام لو۔مجھے سوچ کر جواب دو۔میں پھر آؤں گا۔''۔

خبردار، جو دوبارہ یہاں قدم رکھا،حرام کے تُخم۔خنزیر کی اولاد۔تم جاتے ہو یا بُلاؤں مُشٹنڈوں کو۔فیروزہ کی اونچی آوازیں سُن کر ایک بھڑوا آیا اور اُس نے کالے خان کو دھکے مار کر کوٹھے سے باہر نکال دیا۔وہ بیچارہ اُداس، غمگیں، پھر گامی کی دکان پر آ بیٹھا۔کالے خان

کو دیکھ کر ہم نے پوچھا۔ ''فیروزہ کے کوٹھے پر کیا لینے گئے تھے؟''۔

''ظاہر ہے، دُرود پڑھنے تو نہیں گیا تھا۔ اُسے اپنا سینا چیر کر اُس میں اُس کی تصویر دکھانے گیا تھا۔ لیکن فیروزہ کی عقل بھی دوسری عورتوں کی طرح اُس کے ٹخنوں میں بند ہے۔ اُس کی آنکھیں بھی کوری ہیں اور دِل بھی کورا۔ اُس نے مجھے دِل کا دروازہ کھولنے ہی نہیں دیا''۔ کالے خان ہمیں سنا رہا تھا۔ اُس کا کرب اُس کے چہرے سے عیاں تھا۔

گامی بولا۔ ''میں نے تم کو سمجھایا تھا کہ اُن تِلوں سے تیل نہیں نکلنے والا۔ کیوں پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو۔ پر تم باز ہی نہیں آتے۔۔ تم کو عشق ناگ نے ڈسا ہے اور زہر تمہارے جسم میں پھیل چُکا ہے۔ نہ جانے تمہیں کس پیر فقیر نے عشق بوُٹی سُونگھائی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کا مقصد فیروزہ کو بنا لیا۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ عورتیں دکھائیں جتنے رنگ، ایک ہی لذّت ایک ہی ڈھنگ، پھر وہ چاہے فیروزہ ہو۔ زبیدہ ہو، شکنتلا ہو یا روزی۔ سُن کالے خان! نار سفید جھوٹ ہے۔ بے وفا مکّار ہے اور آگ کا انگار ہے۔ اس لئے میری سُن اور اس آگ میں جلنے سے باز آجا۔ فیروزہ کو بھول جا اور نئے رشتے تلاش کر۔ شادی کر لے اور اپنا گھر بسا۔ مگر تُم ہو کہ مانتے ہی نہیں۔ اتنی بے عزتی اور پھٹکار کھانے کے باوجود بھی تمہاری آنکھیں بھنورے کی طرح فیروزہ کے چوبارے کی جانب منڈلاتی رہتی ہیں''۔

کالے خان گامی کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر لمبا سانس لے کر کہنے لگا۔

''گامی یار! تم تو لفظ گھڑنے میں ماہر ہو۔ تم سے بھلا کون جیت سکتا ہے لیکن میں اپنے دِل کا کیا کروں''۔

''کالے خان! کیوں کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی کھونٹے سے بندھے گھوم رہے

ہو۔اپنے آپ پر رحم کھاؤ۔ کیوں اس جنم میں دُکھ بھوگنے آئے ہو۔ مجھے تمہارے دُکھ کا بڑا دُکھ ہے۔اس لئے میری بات مان لے۔اُس کمینی ذات کیلئے اپنی زندگی برباد نہ کر''۔

گامی یار! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرا عِشق میرا ربّ ہے اور میری فریاد میرے رب سے ہے۔مُرشّد کہتا ہے کہ ''ربّا! میرے حال کا محرم تو۔تُو ہی تانا،تو ہی بانا،روم روم میں تُو''۔

سورج روز چڑھتا رہا اور ڈھلتا رہا۔آس کا چراغ جلتا رہا لیکن فیروزہ نہیں آئی۔کالے خان کے مُنہ سے آہیں نکلتی رہیں اور وہ ملنگ ہو گیا۔اِس عشق ملنگی میں اُسے دُنیا کی کوئی خبر نہیں رہی۔اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ دیش میں کب آندھی چلی۔کب طوفان آیا اور کیوں آیا۔دھرتی دو پھاڑ کیوں ہوئی۔اِتنا بڑا زلزلہ کیسے آیا کہ جس کی شدِّت کو ناپنا ریکٹر سکیل کے بس سے باہر ہو گیا،اور کیسے اس بھونچال نے انسانیت کو اندھا کر دیا۔لاکھوں لوگوں کی مار کاٹ ہوئی۔کروڑوں اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے۔کالے خان حیران تھا کہ یہ کیسا تنازعہ تھا کہ جسے کوئی حل نہیں کر سکا۔جبکہ صرف ایک کلمے کا فرق تھا ورنہ ہندو مسلمان پیار میں غرق تھا۔شاید مذہب اپنے وجود کا قیدی ہوتا ہے۔جبھی تو تباہی مچاتا ہے۔فسادیوں نے قہر ڈھایا۔سب کچھ چھین لیا۔افراتفری مچ گئی۔لوگ سانسوں کے بھُوکے اپنی جڑیں کاٹ کر بھاگ گئے۔جولاہکہ محلّہ،دلپتیاں محلّہ،پیر مٹھا،تالاب کھٹیکاں،محلّہ افغاناں اور اُستاد محلے کی بستیاں خالی ہو گئیں۔توی،اُدھ اور بسنتر کی ندیوں کے پانی کا رنگ لال ہوا۔بچہ سقاّ کی طرح چیلوں،کوّوں اور گِدھوں کو بھی کچھ دِنوں کا راج ملا،کچا گوشت کھانے والی یہ مخلوق بڑی خوش تھی۔کیوں کہ اُنہیں پہلی بار الگ قسم کا لذیذ گوشت کھانے کو ملا تھا۔لاشوں کا بیوپار ہو رہا تھا۔لاشیں آ رہی تھیں اور لاشیں جا رہی تھیں لوگوں کی

آواجائی لگی ہوئی تھی ۔ایک پل کے فیصلے نے ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہم سے چھین لیا ۔صدیوں کا بھائی چارہ بھیڑیوں نے چیر پھاڑ دیا۔قتل وغارت اور بھاگ دوڑ کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا ۔پھر آندھی اور طوفان تھم گیا ۔جموں کی خالی بستیاں نئے لوگوں نے آباد کیں ۔گامی اور کالے خان کی کوئی خبر نہیں ملی ۔ فیروزہ، زبیدہ، بالی، تاجی اور گوہر جان ،کسی کا اتا پتہ نہیں چلا۔ طبلے ،باجے ، گھنگھرو ،ڈھولک، سرنگی ستار سب بے کار ہو گئے ۔اُردو بازار اُجڑ گیا ۔رونقیں ختم ہو گئیں ۔پنچھی اُڑ گئے ۔ کُچھ دنوں کے بعد مُجھے گامے نائی کی خیریت کی اطلاع مل گئی ۔اُس نے سیالکوٹ کے محلّہ پُورن نگر میں دُکان کھول لی تھی اور باقی کے شوق بھی برقرار رکھے تھے مگر کالے خان کا کوئی اتا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے ۔جموں پھر پہلے کی طرح رسنے بسنے لگا ۔ اُردو بازار، راجندر بازار بن گیا ۔کسبیوں اور ڈیرے دارنیوں کے چوباروں پر سرکار نے قبضہ کر لیا۔ مہاجروں کے مکان ،زمینیں اور جائیدادیں وہاں سے آنے والے شرنارتھیوں کو الاٹ کر دی گئیں ۔خلقت بے شک برباد ہوئی لیکن خدا کی خُدائی آباد رہی ۔

پھر ایک بار میں بھارت پاکستان کرکٹ میچ دیکھنے کیلئے لاہور گیا اور وہاں آباد جموں کے پناہ گزینوں سے مِلا ۔سبھی اپنے ساتھ بیتی وحشت زدہ کہانیاں سُنانے لگے ۔اور جموں کے بارے میں پوچھنے لگے ۔اپنے گھروں سے متعلق ، محلے بازاروں سے متعلق ،گلیوں اور چوباروں کے بارے میں، یار دوستوں کے بارے میں، رشتے داروں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں، اور آنکھیں **بھیگتی** رہیں ۔ مجھے یوں لگا کہ تقسیم کی دِل خراش یادیں ابھی دو چار نسلوں تک ہمیں چُبھتی رہیں گی ۔پھر میں نے کالے خان کے بارے میں

پوچھا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔حالانکہ میرا ویزا لاہور کا تھا۔پھر بھی میں چُپ چاپ سیالکوٹ چلا گیا تا کہ کالے خان کو تلاش کرسکوں۔گاما نائی فوت ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا نائی کی دُکان چلا رہا تھا۔وہاں بھی میں جموں سے گئے لوگوں کو ملا۔اُردو بازار کے ایک پان فروش جس نے سیالکوٹ قلعے کے پاس پان سگریٹ کی دُکان کھولی تھی ، مجھے بتایا کہ کالے خان زندہ ہے اور نارووال میں رہتا ہے۔میں نارووال جا پہنچا اور کالے خان کو ڈھونڈنے لگا۔کچھ ہی دیر میں کالے خان کو میں نے ایک سڑک پر پتھر توڑتے جا پکڑا۔ اُس کو دیکھ کر میرے دِل کو سخت صدمہ ہوا۔وہ کھجور کا چھوہارا بن چکا تھا۔اُس کے بالوں میں چاندی چمک رہی تھی۔مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی۔اُس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا۔ہم دونوں نے خوب آنسو بہائے۔جب من ہلکا ہوا تو میں نے پوچھا۔

''کالے خان! تُم نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے؟ تمہارا تانگہ گھوڑا کہاں ہے؟ فیروزہ کا کوئی اتا پتہ؟ وہ تمہیں ملی یا نہیں؟۔

''بابو! جہاں گئی فیروزہ ، وہاں گیا تانگہ گھوڑا۔میں نے اُسے بہت تلاش کیا۔سیالکوٹ ،جہلم ، میر پور اور لاہور کے رفیوجی کیمپوں میں ڈھونڈا۔لاہور کی ہیرا منڈی سے لے کر راولپنڈی ، پشاور اور کراچی کے مینا بازاروں میں تلاش کیا مگر اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔میں نے ہمّت نہیں ہاری اور اپنے پیار کی گٹھری کو اُٹھائے ، شہر شہر ، گاؤں ، گاؤں گھومتا رہا ، نمازیں پڑھتا رہا ، دُعائیں مانگتا رہا لیکن دُعائیں قبول بھی ہوں ، یہ ضروری تو نہیں ،۔بابو! اِس بُلّھے اور دُلّے کے ملک میں آکر مجھے کوئی سُکھ نہیں مِلا ، بس دُکھ میرے پلے پڑ گیا۔دِلوں کے

سودے میں مجھے بڑا گھاٹا پڑا۔ میں تو رانجھا بن گیا مگر فیروزہ ہیر نہ بن سکی۔ اور یہ زخم میرے اندر ہمیشہ ہرا رہے گا۔ مجھے تڑپاتا رہے گا۔ آخر میں نے اپنے عشق کا جنازہ خود پڑھا اور نارووال آ گیا۔ یہاں پنج پیر کی درگاہ کے حُجرے میں رہتا ہوں۔ درگاہ میں جھاڑو پھیرتا ہوں، صاف صفائی کرتا ہوں۔ اگربتیاں اور موم بتیاں جلاتا ہوں اور جب من بہت اُداس ہو جائے تو اِس سڑک پر پتھر توڑتا رہتا ہوں۔ لیکن میری آنکھیں آج بھی سوتے جاگتے فیروزہ کے چُوبارے کا طواف کرتی رہتی ہیں''۔

میں نے دیکھا کہ کالے خان کے اندر آج بھی عشق کی جوت جل رہی تھی۔ ہم دونوں بہت دیر تک وقت کی کتاب کے اوراق پلٹتے رہے۔ وہ اپنے زخم کُریدتا رہا اور میں مرہم لگانے کا جتن کرتا رہا۔ پھر میں نے کالے خان سے واپس لاہور جانے کی اجازت مانگی۔ جب میں جانے لگا تو اُس نے مجھے روکا اور کہا:

''بابو! یہ پتھر تو میں توڑ لیتا ہوں پر فیروزہ کے دِل کا پتھر مجھ سے ٹوٹ نہیں سکا۔ اور اس بات کا دُکھ مرتے دم تک میرے اندر زندہ رہے گا۔''

میں نے اُسے گلے لگایا۔ اُس کے آنسو پونچھے اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ دُور تک مجھے جاتے دیکھتا رہتا۔ میں نے نارووال سے لاہور کی بس پکڑی اور دوسرے دن واہگہ بارڈر پار کر کے جموں آ گیا۔ پر کالے خان کے الفاظ سارے راستے میرا پیچھا کرتے رہے۔

''فیروزہ کے دِل کا پتھر''۔

یادِ رفتہ

دیمک زدہ کتاب تھی یادوں کی زندگی

ہر ورق کھولنے کی خواہش میں پھٹ گیا

اِس شعر نے میرے دِل اور دماغ کو ہِلا کر رکھ دیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی یادوں کی کتاب کے پھٹے ورقوں پر لِکھی یہ کہانی آپ کو سُناوٗں ____ پنچایت انسپکٹر خواجہ حمید کی بیوی بلقیس بانو سیالکوٹ سے جموں کے محلّہ پیر مِٹھا میں دُلہن بن کر آئی تھی ۔ اُن دِنوں جموں اور سیالکوٹ کے درمیان نہ فقط تجارت ہوتی تھی بلکہ دونوں شہروں کے لوگوں میں دودھ اور لہو کے رِشتے بھی جُڑتے تھے ۔ جموں کی لڑکیاں سیالکوٹ اور وہاں کی لڑکیاں جموں میں بیاہی جاتیں ۔ دُور ہی کتنا ہے ۔ میرے گھر سے صرف چالیس کلومیٹر ۔ اُن دِنوں جموں سے مزدُور اور کاریگر کام کاج کرنے صُبح سویرے بس یا ریل سے سیالکوٹ جاتے اور شام کو گھر لوٹ آتے ۔ اِسی طرح سیالکوٹ سے لوگ رات گذارنے کے لئے جموں کی رنبیر نہر پر آتے اور صبح تڑکے واپس سیالکوٹ چلے جاتے ۔ اِسی لئے رِشتے داریاں اور یاریاں پکی اور بے ضرر تھیں ۔

بلقیس بانو سیالکوٹ کے مشہور بیوپاری شیخ گلزار کی بیٹی تھی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ۔ وہ ددھیال اور ننھیال کی ناز پروردہ تھی ۔ اِسی لئے دونوں جانب سے دیئے گئے تحفے وتحائف سے لدی پھندی آئی تھی ۔ محلّہ پیر مِٹھا میں سیالکوٹ سے آئی نئی دُلہن کے جہیز کی دُھومیں مچی ہوئی تھیں ۔ کئی دِنوں تک اِس شادی کے چرچے جموں کی مُسلم برادری میں ہوتے رہے ۔ خوبصورتی نے بلقیس بانو دامُونہہ چُوما ہوا تھا ۔ اسکے بلوری حُسن کے لِشکارے

پورے محلے کی توقیر کا سبب بنے تھے۔ اُسکے چہرے پر پھُولوں جیسی تازگی اور سلیقے میں گرم جوشی اور سادگی تھی۔ وہ سیالکوٹ سے محبت اور اخوّت کا سبق پڑھ کر آئی تھی۔ اِسی لئے جلد ہی وہ رشتے داروں اور محلے داروں کیلئے گُڑشکر بن گئی اور خواجہ حمید کیلئے پنجیری۔ بے شک بلقیس بانو ذہانت اور مرّوت کی پوتھی لے کر آئی تھی، پھر بھی عام ساسوں کی طرح اُسکی ساس بھی شروع شروع میں انڈے دینے والی مرغی کی طرح اُسکے ساتھ کُڑکُڑ کرتی رہتی....... مگر بلقیس بانو کی دانائی، بُردباری اور مسکراہٹوں نے اُس پر ایسا جادو کیا کہ وہ اپنی بہو کی بلائیں لینے لگی۔ بوڑھی ساس جب بھی اپنی سہیلیوں میں بیٹھتی تو بڑے فخر کے ساتھ بلقیس کے صدقے جاتی اور جھولی بھر بھر دُعائیں دیتی۔ وہ کہتی کہ بلقیس جیسی بہو تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں میں ایک ملتی ہے۔ خواجہ حمید اور بلقیس سب کے لئے ایک مثالی جوڑا تھا۔ شادی کے بعد خواجہ حمید بلقیس کے سفینے کا ملاّح بن کر بہت خوش تھا۔ وہ روز کشتی میں سوار ہوتا اور کئی بار دریا پار کر لیتا۔ اُسکے من کا مور بلقیس کے آگے پیچھے ناچتا رہتا۔ دونوں موج مستی میں مست تھے۔ پھر عشق کی گنڈیریوں نے بلقیس کی کوکھ سجائی اور پیار کی رُت نے شگُن کی کوُک سُنائی اور پھر اللہ سائیں نے دادی کی جھولی میں پوتے کی سوغات ڈال دی۔ کئی دِنوں تک بھانڈ، مراثی اور خواجہ سرا گھر میں دھمال مچاتے رہے۔ جموں بھائی چارے کی مُرلی بجاتا رہا۔ پھر خُدا جانے موسم کو کیا ہوا کہ نیلے آسمان کو کالے بادلوں نے گھیر لیا اور لوگوں کے نصیبوں کا چُولہا بُجھ گیا۔ آگ اور دھوئیں سے آنکھیں جل گئیں۔ دیش کے بٹوارے نے لوگوں کے دِلوں میں گانٹھ باندھ دی۔ انسان..... ہندو، مسلمان اور سِکھ بن گیا اور دھرم کے جِنّ نے انسانیت کا خون کر دیا۔ جموں میں افراتفری مچ گئی۔ خواجہ حمید، پنچایت انسپکٹر تھا اور اُس کے کارِندوں نے پہلے ہی اُسے اطلاع

دے دی تھی کہ جموں میں غارت گری اور مار کاٹ ہونے والی ہے۔ اِسی وجہ سے اُس نے بلقیس اور بچے کو اپنی بہن کے پاس بانہال بھیج دیا اور خود ڈیوٹی پر حاضر رہا۔ خواجہ حمید بڑا دِلدار شخص تھا۔ اُسکی یاری جموں کے امیرزادوں، فقیرزادوں اور غنڈے موالیوں سب کے ساتھ تھی۔ اسی لئے جب مار کاٹ شروع ہوئی تو اُسکے بچپن کے دوست اور ہمسایے بلرام پنڈت نے خواجہ حمید کو اپنی پاٹھ شالا میں چھُپا کے رکھا لیکن اُسکے ماں باپ، بھائی اور کئی دوسرے رشتہ دار بلوائیوں نے گھروں کے اندر ہی مار ڈالے۔ کہتے ہیں کہ زمین کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کیلئے لاشیں مانگتی ہے اور موت کا کام ہے کہ زندگی کے کھلونے توڑتی رہے اور زمین کا پیٹ بھرتی رہے۔ اسی لئے زندگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ راجے نے راج دھرم نہیں نبھایا۔ وہ بھی کیا کرتا۔ وہ خود بے بسی کی بھٹّی میں سڑ بل رہا تھا۔ سب کُچھ ختم ہو گیا۔ پھر نئی سرکار نے جنم لیا اور بلوائیوں کی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ لُچے، خونی دِرندے راج نیتی کا لحاف اوڑھے زمین دوز سُرنگوں میں غائب ہو گئے لیکن خلقت کو بے حال کر گئے۔ بلوائی دیمک کی طرح تباہی مچا گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جس گھر کو دیمک لگے، اُسکا کچھ نہ بچے۔ کالی راتوں میں ڈرا ہوا سنّاٹا سہم گیا اور من کا ماتم بہت دیر تک چیختا رہا۔ متاثرہ لوگ اپنے دُکھوں کی عمر قید کاٹنے لگے۔ ایسے سنجوگ بنے کہ آنسوؤں کے گلے آنسو لگے۔ نئی سرکار حالات پر قابو پانے کے دعوے کرنے لگی۔ عوام کو یقین دلانے لگی کہ اُنکی جان کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اُنکی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ سرکار ہر متاثرہ خاندان کو مالی امداد دے گی۔ پر سرکار کو کون سمجھائے کہ تھنوں سے دھویا ہوا دُودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا، اور تازہ زخم جلدی نہیں بھرتے۔ وقت تو سیلابی پانی کی طرح شور مچاتا گذر جاتا ہے لیکن لوگوں کا کڑا نقصان کر جاتا ہے، جس کی

بھر پائی بڑی مُشکل سے ہوتی ہے۔

_____ خیر حالات سُدھرنے لگے۔ یاریاں، پیڑیں بانٹنے لگیں اور من ہلکا کرنے لگیں۔ لوگوں نے دِل کی مٹی کو زیادہ دیر گیلا نہیں رہنے دیا۔ اُنہوں نے اُس میں زندگی کے نئے پودے لگانے شروع کر دیئے۔ خواجہ حمید دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ بلقیس اور نادر کو بانہال سے واپس لے آیا۔ بلقیس بانو جموں میں مچی تباہی کو دیکھ کر بہت دُکھی ہوئی لیکن اُس نے ہمّت نہیں ہاری۔ اُس نے عورتوں کی ایک جماعت بنائی اور ریفوجی کیمپوں میں جا کر بیوہ عورتوں اور بدنصیب بچیوں کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ وہ اُنھیں دلاسہ دیتی۔ باغ، سدھنوتی، مظفر آباد، کوٹلی اور میرپور سے آئے مہاجروں کی خبر گیری کرتی جو یادوں کی چٹائی پر بیٹھ کر اپنے زخم کُریدتے رہتے۔ اُن کے دُکھ بھرے قصّے سُن کر اور اُنکی حالت دیکھ کر بلقیس بانو جذباتی ہو جاتی۔ وہ رونے لگتی۔ اُن اُداس پلوں میں وہ مُلک کی تقسیم کے فوراً بعد آئی فِلم ''زینت'' میں نُور جہاں کا گایا گیت گانے لگتی۔

''آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اُجڑ کے رہ گیا''۔

پھر سب ٹھیک ہوگیا۔ زندگی دوبارہ رسنے بسنے لگی۔ خواجہ حمید بلقیس بانو کی رُوپ صراحی سے پیار کا شربت پینے لگا۔ اُن کے دو بچے اور پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بلقیس بچوں کے پالن پوسن اور اُنکی تعلیم کی طرف دھیان دینے لگی۔ وہ ایک سُگھڑ، سیانی عورت، محلے اور برادری کے مسائل حل کرانے کی کوشش کرتی۔ رشتے داروں اور برادری میں ہونے والی شادیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ سبھی اُس سے پوچھ کر شادی غمی کی رسموں کا انتظام کرتے۔ منگنی، مہندی اور شادی کی محفلوں میں وہ ڈھولکی پکڑ لیتی اور لڑکیوں کا جھنڈ

بنا کر نُور جہاں، سُر یندر کور، پرکاش کور اور زبیدہ خانم کے گائے مشہور پنجابی گیت گانے لگتی۔ نمکین چائے اور کتلمے مہمانوں کو پیش کرتی اور تقریب کے آخر میں بتاشوں کے لفافے دیتی۔ ایسے ہی، فوتگی والے گھروں میں جا کر زندگی اور موت کے فلسفے کو سمجھاتی۔ مان لیجئے کہ بلقیس بانو جموں کی پُوری مسلم برادری کی ضرورت بن چکی تھی۔ برادری کے لوگ اُسکی عزّت کرتے۔ اُسکا احترام کرتے اور پیار سے اُسے باجی بلقیس بُلاتے۔ خالد اور نسیم کی شادی میں، سارا انتظام باجی بلقیس نے ہی کیا تھا۔

محلے داروں اور برادری کو دعوت دینے کیلئے، کس نائن کو بھیجنا ہے، بارات یا ولیمے میں، کس نائی سے دیگیں پکوانی ہیں، اسکا فیصلہ باجی بلقیس کرتی۔ دُلہن کے کپڑے خریدنے ہوں، زیور بنوانے ہوں یا اور خریداری کرنی ہو تو باجی بلقیس کا ساتھ جانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کسی کے گھر بیٹے کی پیدائش ہو تو بھانڈوں اور ہجڑوں کو بلانے کا فیصلہ بھی وہی کرتی۔ جمعرات کی نیاز یا قرآن خوانی کیلئے، کس مولوی کو بُلانا ہے اس کے لئے بھی باجی بلقیس سے مشورہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ پنج پیر، باباجیون شاہ ولی، گُمٹ والے پیر بابا اور بابا بُڈھن شاہ کی درگاہوں پر لوگ اُسے ساتھ لے جاتے تا کہ وہاں پکائے جانے والے پلاؤ اور میٹھے چاولوں کو وہ غریبوں میں تقسیم کرے۔ غرض مسلم برادری کے ہر گھر میں باجی بلقیس کی دانشمندی کا چرچا تھا۔ جب باجی بلقیس کا بڑا بیٹا نادر کیمسٹری میں ایم، ایس، سی کر کے اُودھمپور کالج میں لیکچرار لگا تو باجی بلقیس نے اپنے گھر قرآن خوانی رکھی اور پوری برادری کو دیسی گھی میں پکایا ہوا گوشت والا پلاؤ، روغن جوش کا سالن اور زردہ کھِلایا تھا۔

جموں امن، شانتی کا پنگھا جھول رہا تھا۔ لوگ پہلے کی طرح سُکھ کا سانس لے رہے تھے۔ باجی

بلقیس کا دوسرا بیٹا انجینئرنگ کالج سری نگر میں پڑھ رہا تھا اور بیٹی کلثوم بارویں جماعت میں تھی۔ ہر طرف امن وچین تھا لیکن پھر 1967ء میں ہلکا سا بھونچال آیا۔ کشمیر میں عشقے کی کونپل پھوٹی اور محبت چور سپاہی کا کھیل کھیلنے لگی۔ عشق مُشک کی خوشبو جب پھیلی تو پرمیشوری دیوی، پروین اختر بن چکی تھی۔ کشمیری پنڈتوں نے خوب اُچھل کود مچائی۔ احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہوئے۔ کشمیر کی کرنی جموں کے گلے پڑگئی۔ پُرانی منڈی کے ''وسیع میدان'' میں جلسے ہونے لگے۔ ''ایک کا بدلہ سو سے لیں گے'' اور ''ہماری بیٹی واپس کرو'' کے نعرے لگتے۔ روز نئی نئی افواہیں پھیلائی جانے لگیں۔ جموں کی مُسلم برادری ایک بار پھر سہم گئی۔ بھلا اقلیت کی اوقات ہی کتنی ہوتی ہے۔ باجی بلقیس کا دِل بُجھ گیا۔ جیون کوکھ میں ڈر، وہم اور اُداسی پلنے لگی۔ اُسے اپنے بھائی یاد آنے لگے۔ کئی بار، رات کو اپنی چھت پر چڑھ کر وہ سیالکوٹ شہر کی جلتی بتیاں دیکھتی۔ وہ سوچتی کہ کتنا آسان تھا سیالکوٹ جانا۔ اگر ٹانگے پر بھی جاتے تو بھی تین چار گھنٹے ہی لگتے تھے۔ پر کانٹے دار تار اور سرکاروں کے طریقۂ کار نے سب کُچھ مُشکل بنا دیا تھا۔ بلقیس کئی بار خواجہ حمید کو کہتی کہ وہ سب کے پاسپورٹ بنوائے تاکہ سبھی سیالکوٹ جاسکیں لیکن ہر بار وہ انکار کر دیتا اور کہتا کہ جب تک وہ سرکاری نوکری میں ہے، وہ پاکستان جانے کا نام تک نہ لیں۔

پھر خواجہ حمید کیلئے سرکاری نوکری کا چولا اُتارنے کا وقت آ گیا۔ اپریل 1976ء میں وہ ملازمت سے فارغ ہوگیا۔ باجی بلقیس نے اُس پر پاسپورٹ بنانے کیلئے پھر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ خواجہ حمید نے پاسپورٹ بنوانے کیلئے فارم منگوائے اور سب کے فارم بھر کر پاسپورٹ دفتر میں جمع کرا دیئے۔ تین چار مہینوں کے اندر اندر سب کے پاسپورٹ بن گئے

۔خواجہ حمید اور باجی بلقیس پاسپورٹ لیکر دہلی چلے گئے اور پاکستان ہائی کمیشن سے اپنا اور بچوں کیلئے لاہور اور سیالکوٹ کا ویزا لگوا کر جموں آ گئے۔ باجی بلقیس اور بچے خوش تھے کیونکہ پاکستان بننے کے بعد وہ پہلی بار سیالکوٹ جا رہے تھے۔ پاکستان جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ باجی بلقیس بھائیوں، بھاوجوں اور اُنکے بچوں کیلئے کپڑے اور دیگر تحائف خریدنے لگی۔ اور پھر ایک دِن خواجہ حمید نے مکان کو تالا لگا کر چابیاں اپنے دوست بلرام پنڈت کو سونپ دیں تاکہ وہ گھر کا دھیان رکھے اور صاف صفائی کراتا رہے اور خود پاکستان کے سفر پر چل پڑے۔ واہگہ بارڈر پر دونوں ملکوں کے کسٹم اہل کاروں نے سامان کی جانچ پڑتال کی اور دیگر کاروائیاں پوری ہونے کے بعد سبھی پانچ بجے تک سیالکوٹ پہونچ گئے۔ باجی بلقیس پاکستان بننے کے بعد پہلی بار بچوں کو لیکر سیالکوٹ گئی تھی۔ وہاں پہونچ کر پتہ چلا کہ اُسکے ماں، باپ فوت ہو چکے تھے۔ بھائیوں نے جدّی مکان بیچ کر الگ الگ کوٹھیاں بنالی تھیں۔ کاروبار بھی الگ الگ کر لئِے تھے مگر بہن اور بہنوئی کی وجہ سے سبھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ بھائی بھابھیاں گرم جوشی سے گلے ملیں۔ فرحتِ جذبات میں آنکھوں سے آنسو چھلکے۔ اُداسی اور رنجیدگی دُور ہوئی۔ نادر، قادر اور کلثوم کی نذر اُتاری گئی۔ پیار سے اُنھیں گلے لگایا گیا۔ باجی بلقیس نے بڑے چاؤ سے سب کو تحائف بانٹے۔ رشتے داروں سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ دعوتیں ہونے لگیں۔ ایک مہینے کا ویزا ختم ہوتے پتہ ہی نہ چلا۔ بھائیوں کے ذاتی رُسوخ سے ویزے کی معیاد دو مہینوں کے لئے مزید بڑھ گئی۔ یوں ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ رشتے دار آتے جاتے رہے۔ محفلیں سجتی رہیں۔ جموں وکشمیر کی سیاست اور حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر بھائیوں نے دِن تقسیم کر لئے کہ کِتنے کِتنے دِن یہ لوگ کِس کِس کے پاس رہیں گے۔ چاہت کی ماری باجی بلقیس بھائیوں کو دیکھ کر جذباتی

ہو جاتی۔ حالانکہ وہ جان گئی تھی کہ بھائیوں اور بھابھیوں میں اینٹ اور پتھر کا پیار ہے لیکن وہ کِسی کو کچھ نہیں کہتی تھی کیونکہ یہ تو وہاں کے ہر گھر کی کہانی تھی۔

____ پھر ایک دِن سب سے بڑے بھائی نے بہن کے آگے جھولی پھیلائی اور اپنی بیٹی کے لئے نادر کا رشتہ مانگا۔ دوسرے بھائی نے بھی اپنی بیٹی کیلئے قادر کو چُنا اور تیسرے بھائی نے اپنے بیٹے کیلئے کلثوم کا ہاتھ مانگا۔ سارے بھائی مالی طور پر آسودہ تھے۔ سب کی اپنی اپنی فیکٹریاں تھیں جن میں کھیلوں اور سرجری کا سامان تیار ہوتا تھا اور بیرونِ ملک بھیجا جاتا تھا ۔اس لئے باجی بلقیس کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ جموں کی مُسلم برادری میں غُربت اور ناخواندگی کی وجہ سے اچھے رِشتے ملنے محال تھے ___ لیکن خواجہ حمید، کلثوم کا رشتہ سیالکوٹ میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے اپنی آنکھوں سے دُور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کلثُوم کی جُدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اُسے جموں میں ہی بیاہنا چاہتا تھا تا کہ کلثُوم اُسکی آنکھوں کے سامنے رہے، لیکن باجی بلقیس کے بھائیوں نے اُسے گھیر لیا اور سبز باغوں کی ایسی سیر کرائی کہ وہ بھی مان گیا۔ تینوں بچوں کی شادی بڑی سادگی کے ساتھ ہوئی۔ باجی بلقیس خوش تھی کہ وہ بچوں کی ذمے داری سے فارغ ہوگئی۔ اب سبھی بھائی اپنی بہن اور بہنوئی کو سمجھانے لگے کہ جموں میں اُنکا کوئی نہیں ہے۔ سارے قریبی رشتے دار سن سنتالی کے دنگوں میں شہید ہو چکے ہیں۔ لہذا اب وہ پاکستان میں مُستقل سکونت اختیار کرلیں۔ اُنکے لئے پاکستانی شہریت دلانا کوئی مشکل کام نہیں، مگر خواجہ حمید جموں چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ جموں کی مٹی اُس کے شریر میں رچی بسی تھی۔ جموں کی مٹی میں اُسکے دوستوں کا گُلدستہ تھا۔ جموں میں اُس نے ساری عمر نوکری کی تھی۔ سیالکوٹ اُس کے لئے ایک اجنبی شہر تھا

،خاص کر ملک کی تقسیم کے بعد۔ وہ تو صرف باجی بلقیس کے کہنے پر یہاں آیا تھا تاکہ وہ اپنے بھائیوں اور دیگر رشتے داروں سے مِل سکے۔ وہ جلد واپس جموں جانا چاہتا تھا۔ وہ باجی بلقیس کو سمجھاتا۔

''پیڑ اپنے باغ میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ بیگانی مٹی میں وہ جڑ نہیں پکڑ پاتے۔ سُوکھ جاتے ہیں۔ پھر اپنا مکان تو کوٹ سمان ہوتا ہے۔ تم نے یہ ضرب المثل نہیں سُنی کہ جو سُکھ چھجّو کے چُبارے، نہ بلخ نہ بخارے۔ اِس لئے واپسی کی تیاری کر۔ بلقیس! اپنے گھر سے بڑی کوئی درگاہ نہیں ہوتی۔ چلو چلتے ہیں، اور اپنی درگاہ میں چراغ روشن کرتے ہیں۔ اپنے گھر کی مجاوری کرتے ہیں۔ یہاں میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ میں جموں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارا نادر لیکچرار لگا ہوا ہے۔ قادر نے بھی انجینئرنگ کی پڑھائی مکمل کر لی ہے۔ اُسے بھی اچھی نوکری مل جائے گی۔ ہم اپنے گھر میں سُکھی جیون گذاریں گے۔ اسلئے جموں چلنے کی تیاری کرو''۔

لیکن باجی بلقیس بھائیوں کے موہ جال میں ایسی پھنسی کہ اُس نے جموں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ خواجہ حمید کو سمجھانے لگی۔

''کلثوم کا اب جموں جانا بہت مُشکل ہو گیا ہے۔ وہ اب صرف ویزے پر ہی جموں جا سکتی ہے۔ تُم اُسکی جُدائی کیسے برداشت کرو گے۔ نادر اور قادر کی دُلہنیں بھی اپنا مائیکہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے مجھے کہہ بھی دیا ہے لہٰذا اب ہمیں یہاں ہی رہنا پڑے گا۔ اِسی میں ہماری اور بچوں کی بھلائی ہے۔

باجی بلقیس کے فیصلے کے آگے خواجہ حمید بے بس ہو گیا۔ پھر ویزا ختم ہونے سے پہلے ہی باجی

بلقیس کے بھائیوں نے سبکو پاکستانی شہریت دلادی۔ اپنے اثر ورسوخ سے اُنہوں نے نادر کو حبیب بنک میں منیجر لگوادیا اور قادر کو واپڈا میں نوکری دِلوادی۔ سارے بھائی خوش تھے کہ اُن کی بیٹیاں آباد ہو گئیں، اور اُنکا مائیکہ بھی سلامت رہا۔ باجی بلقیس بھی خوش تھی کہ وہ دوبارہ اپنے آبائی شہر میں رہنے لگی تھی لیکن خواجہ حمید گُم صُم رہنے لگا۔ اُس نے سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا، اور پورا کنبہ الگ سے رہنے لگا۔ خواجہ حمید کو جموں کی یاد ستاتی رہتی۔ اپنا گھر، گلیاں، محلے دار، یار بیلی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے۔ ایک دِن اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''تیرا من اب یہاں لگ گیا ہے۔ تم اپنے بھائیوں، بھاوجوں اور دوسرے رشتے داروں میں خوش ہو۔ ہمارے بچے بھی آباد ہیں مگر میں ایک بار جموں جانا چاہتا ہوں تاکہ گھر، جائیداد بیچ کر، اُس رقم سے یہاں اچھا سا مکان خرید سکوں، اور اپنی پنشن کی منتقلی کا انتظام بھی کر سکوں۔''۔

باجی بلقیس مان گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ نادر کا سالا دوبئی میں کاروبار کرتا ہے۔ اُسکے بنک کھاتے میں بھارتی کرنسی جمع کرادی جائے گی اور وہ ساری رقم سیالکوٹ بنک میں منتقل کر دے گا۔ ساری باتیں طے ہونے کے بعد ___ ایک دِن خواجہ حمید واپس جموں لوٹ آیا۔ اُس نے اپنے ساتھ بیتی ساری کہانی اپنے دوست بلرام پنڈت کو سُنائی اور اُس سے گذارش کی کہ وہ ''میراں صاحب'' والی دس ایکڑ زمین، تالاب کھٹیکاں والا مکان اور اپنا جدّی گھر بِکوانے میں اُسکی مدد کرے۔ جلد ہی اُسے خریدار مِل گئے۔ ''میراں صاحب'' والی زمین مظفرآباد سے آئے ایک سِکھ شرنارتھی نے خرید لی۔ محلہ اُستاد والا مکان سُہیل احمد نے

خرید لیا اور محلّہ پیر مِٹھا والا مکان بلرام پنڈت نے لے لیا۔ ساری رقم خواجہ حمید نے باجی بلقیس کے بھتیجے اور نادر کے سالے کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دی۔ وہ پانچ چھ مہینے جموں میں رہا اور پھر اپنے شہر کو آخری سلام کرکے سیالکوٹ واپس چلا آیا۔ اب وہ اپنی رقم کی وصولی کا انتظار کرنے لگا جو دوبئی سے کبھی نہیں آئی۔ چٹھیاں، پیغام، ٹیلیفون، تار، سب بے کار۔ سالے پہلے دم دلاسا دینے لگے ___ پھر دھیرے دھیرے اُنہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ نادر اور قادر اپنی بیویوں کے میاں مٹھو بن گئے۔ سب کا لہو سفید ہو گیا۔ خواجہ حمید کو اپنے سالے اور سمدھی سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اُسکے دونوں بیٹے اُسکے پیڑ کے کمزور پتے تھے۔ ہوا کے جھونکے سے ہی سُسرالیوں کی جھولی میں جا گرے۔ باجی بلقیس بھائیوں کی بے رُخی دیکھ کر بڑا اثر پی۔ چیخی چلائی لیکن کُچھ نہ کر سکی۔ وہ بھائی بھتیجے کے ہاتھوں لُٹی گئی۔ کوئی رِشتہ کام نہیں آیا۔ اپنے بیٹوں نے بھی ساتھ نہ دیا۔ دونوں میاں بیوی فِکروں میں ڈوبے اِس درد کو جھیلتے رہے۔ رشتے داروں نے مسئلے کو سُلجھانے کی کئی بار کوشش کی، مگر کُچھ حاصل نہ ہوا۔ تنگ آکر خواجہ حمید نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جموں، کشمیر بنک سے دوبئی بنک میں رقم ٹرانسفر کرنے کی رسید کی نقل بھی درخواست کے ساتھ نتھی کی۔ اپنی طرف سے اچھا وکیل کیا۔ مقدمہ شروع ہوا۔ لیکن باجی بلقیس کے بھائی اثر، رُسوخ والے لوگ تھے۔ وہ کبھی لمبی لمبی تاریخیں ڈلوا دیتے اور کبھی کیس لگنے ہی نہیں دیتے۔ خواجہ حمید عدالتی کبوتر بن گیا جو ایک مدت تک عدالت میں ہی غٹرغوں کرتا رہا پھر تھک ہار کر اپنی کابک میں بیٹھ گیا۔ جو بھائی باجی بلقیس کے لئے ہر چیز نچھاور کرنے کے دعوے کرتے تھے، وہ وقت آنے پر ایک پائی بھی نہ دے سکے۔ اُنہوں نے تو ایک دم پلّو جھاڑ لیا۔ اپنے بھائیوں کا روکھا اور کڑوا سلوک دیکھ کر باجی بلقیس خُون کے آنسو روئی۔ اُسکے شریر کا ماس جھڑ گیا اور وہ ہڈیوں کا پنجر بن گئی

۔اُسکا غرور ٹوٹ گیا۔ اُسکے دونوں بیٹے بھی خودغرض ہو گئے۔ وہ تو بیویوں کے پنجروں کے طوطے بن چکے تھے۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اُسکے اپنے بال ہی اُسے کنگال کر دیں گے۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر اُسے تپ دِق اور دمے کی بیماری نے جکڑ لیا۔ حالت یہ ہوگئی کہ دوائی کے لئے بھی پیسے نہیں رہے۔ پھر ربّ نے سبب بنایا۔ خواجہ حمید کا ایک پُرانا محلّے دار انجینئر غلام سرّور جو 1947ء کی شورش میں سیالکوٹ بھاگ آیا تھا، اُسے اچانک سیالکوٹ قلعے کے پاس مِل گیا۔ وہ اُن دِنوں منگلا ڈیم کا چیف انجینئر تھا۔ جب اُس نے خواجہ حمید کی آپ بیتی سُنی تو اُسے بڑا دُکھ ہوا۔ وہ دونوں میاں بیوی کو میر پور لے آیا۔ جہاں اُس نے خواجہ حمید کو منگلا ڈیم کا سیکورٹی افسر لگا دیا۔ یہ تقرری تین سال کیلئے تھی کیونکہ غلام سرور اِس سے زیادہ مدت کی ملازمت دینے کا مجاز نہیں تھا۔ یوں خواجہ حمید اور باجی بلقیس میر پور میں رہنے لگے۔ غلام سرور کے دو بیٹے تھے اور دونوں لندن میں مُستقل آباد تھے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بچوں کے پاس لندن جانا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے خواجہ حمید کو اپنی کوٹھی میں ہی رکھا۔ نوکری سے فارغ ہونے کے بعد غلام سرور نے کمرہ، کچن اور بیٹھک خواجہ حمید کی رہائش کے لئے کھُلی چھوڑ دی اور باقی کمروں کو تالا لگا کر چابیاں باجی بلقیس کے حوالے کیں تاکہ کوٹھی کی صفائی ہوتی رہے اور خود لندن چلا گیا ____ باجی بلقیس اور خواجہ حمید میر پور میں اکیلے رہنے لگے۔ جموں سے ہجرت کر کے آئے اور میر پور میں آباد کچھ لوگوں نے خواجہ حمید سے میل ملاپ بڑھانے کی کوشش کی، لیکن خواجہ حمید کو حالات نے اتنے گہرے زخم دیئے تھے کہ وہ کسی کے ساتھ راہ و رسم رکھنے کو تیار نہ تھا۔ دُکھوں نے اُسکے بدن میں اتنے چھید کر دیئے تھے کہ وہ بیمار رہنے لگا۔ اُس نے بیماری کے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے مگر وہ اُسے چھوڑنے کیلئے تیار نہ ہوئی۔ اُسے اپنے سالوں سے زیادہ بیٹوں کا دُکھ تھا

۔دونوں میاں بیوی روٹی کے بدلے اپنی اولاد کا غم کھانے لگے۔خواجہ حمید کی زندگی کا سُو کھا پیڑ ٹوٹنے لگا اور وہ موت کا ذائقہ چکھنے کیلئے تیار ہو گیا۔ایک دِن اُس نے اپنے داماد کو فون کیا اور اُسکی منّت سماجت کی کہ وہ اپنی پھوپھی اور ساس کا اُسکے مرنے کے بعد خیال رکھے کیونکہ اب اُسکے دم کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔وہ نہیں جانتا کہ کب رُوح اُسکے جسم سے پرواز کر جائے ____ بیماری نے اُسکے جسم کو پوری طرح سے کھوکھلا کر دیا تھا اور پھر ایک دِن اُسکے دُکھوں کی عمر قید ختم ہو گئی۔جنازے میں شامل ہونے کیلئے اُسکے دونوں بیٹے، اُن کی بیویاں اور داماد و بیٹی آئے تھے۔بے وطنا خواجہ حمید میر پور میں دفن ہوا۔بیٹوں نے ماں کو ساتھ چلنے کیلئے کہا۔بیٹی اور داماد نے بہت زور لگایا۔بیٹی ماں کو سمجھانے لگی کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی۔وہ اُن کے ساتھ رہے لیکن باجی بلقیس نے کِسی کی نہ سُنی۔چہارم کی رسم کے بعد سبھی اپنے اپنے گھر چلے گئے اور باجی بلقیس اتنی بڑی حویلی میں اکیلی رہ گئی۔

یہ اپریل 2005ء کی بات ہے جب خالد اور نسیم سری نگر سے مظفر آباد جانے والی پہلی بس میں اپنے رشتے داروں سے ملنے میر پور گئے تھے۔وہاں باتوں باتوں میں خواجہ الطاف راؤ نے بتایا کہ باجی بلقیس میر پور میں غلام سرور کی کوٹھی میں رہتی ہے۔راؤ صاحب کے والد بھی جموں کے محلّہ اُستاد سے ہجرت کر کے میر پور میں آباد ہو گئے تھے۔الطاف راؤ ایک مقامی صحافی ہیں اور کئی بین الاقوامی اور قومی اخبارات سے منسلک ہیں۔خالد اور نسیم نے جب باجی بلقیس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک شام خواجہ الطاف راؤ اُنھیں لیکر غلام سرور کی کوٹھی پر گئے ___ پانچ چھ کنال زمین میں بنی حویلی کے ایک کمرے میں چارپائی پر پڑی باجی بلقیس نے جب خالد اور نسیم کو دیکھا تو وہ چارپائی سے اُٹھ کر دونوں کے گلے ملی۔اُنھیں

چومنے لگی۔ کمرے میں چارپائی کے علاوہ ایک میز پڑا تھا جس پر دو تین برتن، تین کپ، کچھ ڈبے اور ایک اسٹوو۔ انہوں نے دیکھا کہ باجی بلقیس کو کُب پڑا ہوا تھا۔ وہ پوری طرح کُبڑی ہوگئی تھی۔ آنکھوں پر موٹی سی عینک لگی ہوئی اور چلنے کیلئے چھڑی کا سہارا۔ اپنے وقت کی انتہائی خوبصورت باجی بلقیس ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی ۔ اُس نے نسیم کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگی۔

"نسیم! نہ جانے وہ کون سا بُرا وقت تھا جب میں جموں چھوڑ کر سیالکوٹ آئی۔ دِل مرجانے کے کہنے میں آ کر میں بڑا پچھتائی۔ مجھ سے بڑی بُھول ہوئی۔ میں اپنے سگے بھائیوں کے ہاتھوں لُٹ گئی۔ میری اولاد بھی بے وفا نکلی ۔ میرے نجس پُوت، کپُوت نکلے ۔ میرے بھائیوں اور بھاوجوں کے اندر مغروری اور تکبّر کے سانپ پھُنکارتے رہتے اور ہمیں ڈستے رہتے ۔ یہاں آ کر میں اُجڑ گئی ۔ یہاں ہمیں صرف دھوکے مِلے ۔ یہاں دوُدھ اور لہو کے رشتے پانی ہوگئے ۔ ہم نے یہاں صرف پت جھڑ کا موسم ہی دیکھا۔ ذِلّت، نفرت، حقارت، بدبختی، رسوائی اور محتاجی دِن رات ہمارا پیچھا کرتی رہی۔ بدنصیبی میرا جُرم بن گئی ۔ خواجہ صاحب بھی ساتھ چھوڑ گئے ۔ وہ فوت ہوگئے ۔ وہ آزاد ہوگئے ۔۔۔ دُکھوں، تکلیفوں سے ۔ پر میں دُکھیاری چراغ بُجھنے کے انتظار میں ہُوں ۔ یہ الطاف بیٹا روز میرے پاس آتا ہے۔ ہر چیز لا کر دیتا ہے ۔ میرا پورا دھیان رکھتا ہے ۔ شاید یہ میرے یا اپنے پچھلے جنم کا اُدھار چُکا رہا ہے ۔ اللہ اِسے خوش رکھے ۔ آباد رکھے ۔ یہ اپنے بچوں کا محتاج نہ ہو ۔ اُنکے ہاتھوں ذلیل نہ ہو ۔ میں اِسے جی بھر کے دُعائیں دیتی رہتی ہوں ۔ اللہ کرے کہ وہ میری سُنے ۔ خالد! میرا بوڑھاپا ۔۔۔ بڑا بے اعتبارا ہے ۔ کِسی بھی وقت بلاوا آ سکتا ہے ۔ تم

میرا ایک کام کردو۔ کسی آنے والے کے ہاتھ جموں کی مِٹی بجھوا دینا تا کہ میں وہ خواجہ صاحب کی قبر پر ڈال سکوں۔ وہ مرتے دم تک جموں کو ہی یاد کرتے رہے۔''۔

باجی بلقیس کی باتوں کی گراری مشین سے بھی تیز چلتی رہی۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ رات کے نو بج چکے تھے جب نسیم اور خالد وہاں سے نکلے۔ الطاف راؤ نے اُنھیں تصّور سلہریا اور عاشق سلہریا کے گھر اُتارا جو نسیم کے پھوپھی زاد تھے اور جن کے پاس وہ ٹھہرے تھے۔ پرمٹ کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ اِس لیے وہ دونوں دوسرے دِن مظفر آباد آ گئے اور اگلے دِن وہاں سے سری نگر لوٹ آئے۔

سن 2009ء میں خالد ادیبوں اور صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ لاہور گیا تا کہ عالمی پنجابی کانفرنس میں شرکت کر سکے۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد وہ میر پور چلا گیا۔ وہاں پہونچ کر اُسے پتہ چلا کہ باجی بلقیس بھی فوت ہو چکی تھی۔ اُس نے عاشق سلہریا اور الطاف راؤ کو ساتھ لیا اور باجی بلقیس اور خواجہ حمید کی قبروں پر فاتح پڑھنے کیلئے قبرستان گیا۔ جموں سے لایا ہوا مِٹی کا تھیلا اُسکے ساتھ تھا۔ دونوں میاں بیوی کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں، جنہیں دیکھ کر خالد کے دِل میں غضب کی ہوک اُٹھی۔ اُس نے قبروں پر جموں سے لائی ہوئی مٹی ڈالی۔ فاتح پڑھی اور قبرستان سے باہر نِکل آیا۔

-----۔ پر قبرستان کے کِسی پیڑ پر بیٹھی ہوئی کوئل، کی ماتمی کُوک سُن کر اُس کی رُوح کانپ اُٹھی اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

●

اٹوٹ انگ میں پھنسی شہ رگ

قادرا اپنی قسم کا ایک عجیب ، سرِ پھرا اور ہٹیلا جوان تھا۔ بھینسے جیسی چال اور گینڈے جیسی کھال ۔ ذلالت رذالت ، اور خجالت کی کھائی میں غرق ، زبان کا کڑوا۔ قادرا چھوٹی چھوٹی باتوں پر رگیں پھلا لیتا ۔ جب دیکھو دانت پِیستا رہتا اور مغلظات بکتا رہتا ۔ کبھی کِسی کی داڑھی پر ہاتھ ڈالتا تو کبھی کسی کی پگڑی اُچھالتا۔ اُس میں ذرا بھی شرافت نہیں تھی ۔ ہمیشہ غلط حرکتیں کرتا رہتا اور رام روَلا ڈالے رکھتا۔ وہ آوارہ سانڈ ، آگ نِگلتا اور انگارے اُگلتا اور اپنے اندر کی سڑاند باہر نکالتا رہتا۔ قادرا روز صبح تڑکے اپنی بیوی رابعہ کو صلواتیں سُنانی شروع کرتا۔ اُسے پھٹکارتا اور دُھتکارتا رہتا۔ اُس کے دانت گِنتا رہتا۔ لعن طعن کرتا رہتا اور لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر کے اسے لہولہان کر دیتا۔ معمولی سی بات پر اُسکے ماں باپ کو گالیاں بکتا۔ رابعہ درد سے کراہتی رہتی ۔ کبھی اُسکا چہرہ سُوجھا ہوتا تو کبھی ہونٹ زخمی ہوتے ۔ وہ بیچاری اپنے جسم کی چوٹوں کو ٹکوریں کرتی اور زخموں پر مرہم لگاتی ۔ مختصر یہ کہ قادرا ہر وقت رابعہ کے ساتھ کڑُھ کڑُھ لگائی رکھتا اور اسے جوُتیوں میں روٹی پروستا۔ رابعہ کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ''اندر کُتا باہر کاگ، بچ کے جاؤں کہاں بھاگ''۔ وہ ضِدی سانڈ کبھی پیار کی بات نہیں کرتا تھا۔ اکثر اس پر دھونس جماتا اور کہتا،

''سالی کُتیا: تیری اوقات ہی کیا ہے۔ تُو تو تین لفظوں کی مار ہے'' ؛ ۔۔۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مرد کے بولے ہوئے یہ تین لفظ عورت کے لیے کتنے مُضر ، کربناک اور کٹھن ہوتے ہیں ۔ لاکھوں کی سہاگن پل میں ابھاگن بن جاتی ہے۔ عُمروں کے جُڑے رِشتے پل میں خاک ہو جاتے ہیں۔ وہ جیتے جی مر جاتی ہے۔ اُسکا دُکھ دُگنا تِگنا ہو جاتا ہے۔ بے عزّتی کی

پھپھوندی اُسکے شریر پر جم جاتی ہے۔رابعہ کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔وہ جاتی بھی کہاں۔ مائیکہ کب کا اُجڑ چکا تھا۔ماں باپ بھونچال کی بلّی چڑھ چکے تھے۔گھر کوٹھا پا تال میں دھنس گیا تھا۔اِس لیے وہ اس درندے کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور تھی ---قادر جیسے کوڑمغز،اڑیل اور کرّیل شخص کی مار پیٹ اور گالی گلوچ سے رابعہ کی رُوح تارتار ہو چکی تھی اور ضمیر پر لگی خراشوں نے اُس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔آخراس نے قادرے مرُدود کو چھوڑنے کا من بنالیا۔

----اور پھرایک رات، جب قادرا،خنزیر خراٹے مارر ہا تھا۔رابعہ نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی باندھی اوراس کے نرک نواس سے باہر نکل آئی۔رابعہ جواپنے میکے سے سیدھا قادرے کے جہنم میں آئی تھی اور جسے کسی دوسرے ٹھکانے کا پتہ نہ تھا۔وہ اندھیری رات میں اوبڑکھابڑ راستوں پر چلتی رہی۔جنگل بیلے اورندی نالے پھلانگتی رہی۔اُسے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ چلتی رہی۔ پھر جانے کب اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑی اور لڑھکتی لڑھکتی سیدھی نکّرکوٹ کی کسّ میں جاگری۔کسّ کا برساتی پانی اپنے جوبن پر تھا اور بے تاڑ نالے سے گلے مل رہا تھا۔رابعہ کو بھی لہروں نے بے تاڑ کے حوالے کردیا اور بے تاڑ نے اُسے پونچھ دریامیں جا پھینکا۔دریا چڑھا ہوا تھا۔موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔رابعہ پانی کے بھنور جال میں پھنس گئی اور جھلاس گاؤں کے پاس دریا کے اِس طرف آ لگی اورفوجیوں نے جھپٹ لی۔فوجیوں نے رابعہ کو ایسے جھپٹا جیسے چیل سُرخاب پر جھپٹتی ہے۔معمولی پوچھ گچھ کے بعد فوجیوں نے رابعہ کو مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے اپنے ڈھنگ سے اُس کی تفتیش کی اور وِیزا، پرمٹ کے بغیر سرحد عبور کر کے

ہمارے ملک میں داخل ہونے کا الزام لگا کر چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ قسمت کی ماری رابعہ کا اپنا کوئی بھی نہیں تھا جو اُس کے لئے کچہری میں پیش ہوتا ۔ جج بھی اپنے طور پر پریشان تھا کہ وہ رابعہ کو کیا سزا دے کیونکہ رابعہ نکّر کوٹ کی رہنے والی تھی جو آدھا سرحد کے دوسری طرف اور آدھا اِس طرف ہے۔ نکّر کوٹ تحصیل حویلی، کا گاؤں ہے جو آدھی ہمارے پاس ہے اور آدھی سرحد کے پار۔ تحصیل حویلی ضلع پونچھ۔ راولاکوٹ کا حصہ ہے اور یہ علاقہ صوبہ جموں میں شامل ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بھارتی وریاستی آئین اور سرکاری نقشوں کے مطابق پورا جموں وکشمیر بھارت کا حصہ ہے۔ تو پھر اپنے ہی دیش میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آنے جانے کا بھلا کیا جُرم بنتا ہے۔ مگر پولیس نے چالان پیش کرتے ہوئے بھارتی قانون کی خلاف ورزی کرنے اور سرحد پار کرنے کا جُرم عائد کیا تھا اور یوں ثابت کر دیا تھا کہ سرحد کے پار والا علاقہ ہمارا نہیں ہے یا پھر زمین تو ہماری ہے لیکن لوگ ہمارے نہیں ہیں۔۔۔۔ رابعہ سیدھی سادھی ان پڑھ اور بے بس مُٹیار......، بھلا ضابطے، قانون اور حدوں، سرحدوں کو کیا سمجھتی۔ اس نے تو بدبختی کا کفن پہنا ہوا تھا۔ وہ تو قادرے بھیڑیے سے اپنی جان چھُڑانے کے لئے بھاگی تھی۔ اِس لئے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اُسے کہاں رکھا جائے۔ جج نے رابعہ کو تین سالوں کی سزا سنائی اور اُسے پونچھ جیل میں سزا کاٹنے کے لئے ڈال دیا گیا۔

جیل کیا تھی، بس ایک کنجر کوٹھا تھا۔ یہاں مان، مریادا، قدر و قیمت عزّت واحترام جیسے الفاظ جیل کے صدر دروازے پر ہی ٹانک دیے جاتے ہیں۔ اندر بے حیائی، بے غیرتی، بے بسی اور بدنصیبی ناچتی، کودتی رہتی ہے۔ یہاں دھرم، ادھرم اور گندی سیاست کی گیلی لکڑیاں

دُھواں دیتی رہتی ہیں۔جیل میں کئی پہرے دار لنگوٹ کے ڈھیلے ہوتے ہیں۔وہ ٹھرکی ،قیدی عورتوں کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگتے ہیں پھر رابعہ تو تھی ہی خوبصورت۔اُسے دیکھ کر بدکردار سپاہی آپس میں صلح مشورے کرنے لگے اور یہ طے پایا کہ شکر کھاؤ لیکن بانٹ کے کھاؤ مگر انور حوالدار سب سے سیانا شکاری تھا۔وہ جگاڑو آدمی تھا۔اُسے سبھی مولوی کہتے تھے۔اس کی ڈھاڑھی کی جھاڑی میں جھوٹ اور مکاّری کے تنکے کسی کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔نمازیں پڑھنا اور بات بات پر قرآن اور حدیث کے حوالے دینا اُس کے مُول منتر تھے۔خدا کے اُس ''نیک بندے'' کو ہی جیلر نے زنانہ وارڈ کا محافظ بنایا تھا،وہ جب بھی رابعہ کو دیکھتا تو اس کا وضُو ٹوُٹ جاتا۔وہ چرب زبان لیکن خوش گُفتار تھا اور ثواب کمانے کا بہت زیادہ بھوکا۔ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر ثواب کی جھولیاں بھرتا اور دُکھیوں کی دادرسی۔۔۔۔تعویز دھاگے اور جھاڑ پھونک سے کرتا۔رابعہ کی کہانی سُن کر وہ اُس کے دُکھوں کا علاج کرنے لگا۔انور حوالدار رابعہ کو زنانہ وارڈ میں بنے نماز والے کمرے میں روز لے جاتا اور اُسے شریعت اور پرہیزگاری کے سبق پڑھاتا۔وہ کہتا،''ہر نیک مرد اپنی عورت کا لباس ہوتا ہے۔اُسکی شرم وحیا کا رکھوالا۔اسی لئے پاک عورتوں کے لئے ربّ سچّا دین دار مردوں کا انتخاب کرتا ہے اور پاپی عورتوں کے لئے ظالم مردوں کا''۔رابعہ بڑی دلچسپی سے انور مولوی کا وعظ سُنتی۔ایک دن وہ رابعہ سے کہنے لگا۔

''کل رات خواب میں مجھے اللہ میاں نے بشارت دی کہ تمہارے تمام دُکھ درد دُور ہونے والے ہیں۔اللہ سائیں نے تمہاری سُن لی ہے اور میرے رُوپ میں تمہارا بازو پکڑ لیا ہے۔اب تمہارے دِن پھرنے والے ہیں اور تم جلدی جیل سے رہا ہونے والی ہو۔مجھے حکم

ہوا ہے کہ جیل سے باہر آتے ہی تمہارا اور میرا نکاح ہوگا۔ اور تم ہمیشہ کے لیے میری پناہ میں آجاؤ گی''

انور حوالدار رابعہ پر ڈورے ڈالنے لگا۔ دھیرے دھیرے اُسے رابعہ کی آنکھوں میں اپنے پیار کا سُرمادِکھنے لگا۔ وہ احمق انور مولوی کے پریم جال میں پھنستی گئی۔ آخر روغنی دُنبی کب تک بچتی۔ ایک دن قصائی کی چھُری کے نیچے آہی گئی۔ انور مولوی اُس گلنار کی گلوری چبانے لگا۔ کہتے ہیں کہ مالدار امیر اور بھُو کے شریف سے ہمیشہ ڈرنا چاہیئے لیکن رابعہ کو یہ سیانی باتیں کون سمجھاتا۔ وہ نصیبوں کی ماری بھُو کے شریف کی شرافت کا شکار ہوگئی۔ انور حوالدار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اپنی بھُوک مِٹانے کیلئے کئی ہانڈیوں کا ذائقہ چکھنا، وہ اپنا حق سمجھتا تھا اِسی لئے جہاں کہیں چمبہ چنبیلی کا درخت دیکھتا تو درانتی سے اُسے چھانگنا شروع کر دیتا۔ کئی بار کامیاب ہونے پر خوشبو اپنے اندر جذب کر لیتا۔۔۔۔۔ رابعہ کو پونچھ جیل میں آئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ وہ انور حوالدار کی کھٹّی میٹھی باتوں میں ایسی مست تھی کہ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اُس کا پیٹ پھولنے لگا تھا۔ ہر ہفتہ قیدیوں کا معاینہ کرنے کے لئے ضلع ہسپتال سے آنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک لیڈی ڈاکٹر نے جب رابعہ کو غور سے دیکھا اور اس کا اچھی طرح سے معاینہ کیا تو انور حوالدار کی عیاشی کا مٹکا سرِ عام پھُوٹ پڑا۔ جیلر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور وہ منہ سے گالیوں کی غلاظت اُگلنے لگا۔ اُس نے انور حوالدار کی ڈاڑھی، مونچھ منڈوائی۔ اُس کا منہ کالا کیا اور اُسے نوکری سے معطل کر دیا۔ پھر سارے معاملے کی انکوائری کرنے کا حکم دیا۔ رابعہ نے پوچھ گچھ میں شرماتے ہوئے قبول کیا کہ مولوی جی نے اللہ کے حکم سے اس

کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے، جیل سے رہائی کے بعد وہ مجھ سے نکاح کرلیں گے۔ جیل کے اندر باہر سب کو انور حوالدار کی کرتُوت کا پتہ چل گیا۔ پولیس نے انور حوالدار کو گرفتار کرلیا۔ رابعہ نے جیل میں ہی ایک بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام صوفیہ رکھا گیا۔ رابعہ خوش تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو بڑے لاڈ پیار سے پالنے لگی۔ انور حوالدار کے خلاف مقدمہ چلا اور اُسے ایک قیدی عورت کے ساتھ ناجائز جنسی رشتہ بنانے اور جیل ضابطے اور قانون توڑنے کے جُرم میں دس سال کی سزا ہوگئی۔

۔۔۔صوفیہ اب ماں کی گود سے اُتر کر زمین پر رینگنے لگی۔ پھر ہلکے ہلکے قدم اُٹھانے لگی۔ رابعہ کو پونچھ جیل میں آئے تین سال سے زیادہ ہوگئے تھے۔ اس کی سزا پوری ہو چکی تھی۔ جیلر نے اس کے بارے میں اعلیٰ جیل افسران اور عدالت کو اطلاع دے دی تھی اور وہ اگلے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ پر نہ تو عدالت کی طرف سے اور نہ ہی سرکار کی طرف سے کوئی حکم نامہ آیا تھا۔ رابعہ کا یہاں یا وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو اس کی طرف سے عدالت میں رہائی کے لئے درخواست دیتا۔ آخر ایک دن جیلر نے رابعہ کی رہائی کے لیے اُس کی جانب سے ایک درخواست لکھی ۔اُس کا انگوٹھا لگوایا اور درخواست اپنے وکیل دوست اشوک ساہنی کے حوالے کی اور رابعہ کی ساری کہانی سُنا کر اُسکی مدد کرنے کیلئے گذارش کی۔ ساہنی صاحب نے رابعہ کی درخواست ہائی کورٹ میں پیش کی۔ جج صاحب نے سرکار اور جیل حُکام سے رپورٹ طلب کی اور ایک آدھ پیشی میں ہی فیصلہ سنایا کہ رابعہ اور اس کی بیٹی کو رہا کر کے ایک مہینے کے اندر اندر پاکستان کے حوالے کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ جج نے یہ حکم بھی سنایا کہ رابعہ کے ساتھ جیل میں جو شرمناک سلوک کیا گیا، اس گھناؤنے جرم کے لیے اُسے

پانچ لاکھ روپے کا معاوضہ بھی دیا جائے۔عدالتی حکم پر سرکار نے اُسے واپس پاکستان بھیجنے اور معاوضے کی رقم کا چیک دینے کی کاروائی مکمل کی اور پھر پولیس نے ماں بیٹی کو واہگہ بارڈر پر سرحدی حفاظتی پولیس کے سپُرد کیا۔عدالتی فیصلے اور حکم نامے کی نقلیں بھی دیں۔بی ،ایس ،ایف نے پاکستانی افسروں سے رابطہ کیا اور ساری بات سمجھائی۔پاکستانی سرحدی پولیس یعنی رینجرز کے افسروں نے یہ بات تسلیم کر لی کہ رابعہ نکّر کوٹ ضلع پونچھ راولاکوٹ کی رہنے والی ہے اور غلطی سے سرحد پار کر گئی تھی،اس لیے وہ رابعہ کو واپس لینے کے لیے تیار تھے لیکن وہ صوفیہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔اُن کا کہنا تھا کہ صوفیہ بھارتی شہری ہے اس کا جنم جیل میں ہوا ہے۔رابعہ اور جیل ملازم کے ناجائز تعلقات کی وجہ سے صوفیہ پیدا ہوئی ہے۔اسلئے وہ پاکستان میں نہیں رہ سکتی۔بھارتی افسروں نے بہت زور لگایا۔منت سماجت کی لیکن پاکستانی اہل کارٹس سے مس نہیں ہوئے۔جموں کشمیر کو شہ رگ کہنے والے ایک کشمیری بچی کو اپنا شہری ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن رابعہ تو بیٹی کے رشتے کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔صوفیہ اس کی شہ رگ بھی تھی اور اٹوٹ انگ بھی۔وہ اپنے اٹوٹ انگ کو کیسے توڑتی اور اپنی شہ رگ کو کیسے کاٹتی۔اسلئے اُس نے صوفیہ کے بغیر پاکستان جانے سے صاف انکار کیا۔بارڈر سیکورٹی فورس کے مقامی افسر نے پُل کنجری گاؤں کے سرپنچ کو بلایا اور رابعہ اور صوفیہ کو اُس کی سُپردداری میں دیتے ہوئے ہدایت کی کہ ماں بیٹی کا پورا خیال رکھا جائے۔اگر اِن کے ساتھ کچھ بھی بُرا ہوا تو پورے گاؤں کو بھگتنا پڑے گا۔معاملہ دہلی اور اسلام آباد تک پہنچا۔بھارت سرکار نے کئی دلائل دیئے لیکن بات نہیں بنی۔کہتے ہیں کہ جن کے سر میٹھے ہوں ان کی سرداری بھی میٹھی ہوتی ہے لیکن ہمارے دونوں طرف لیڈروں کے سروں میں سیاست کی گندگی جمی ہوئی ہے،بے اعتمادی اور نفرت کا بھوسہ بھرا ہوا ہے

جس کی بدبُو کے کارن عام جنتا ستائی اور اُکتائی ہوئی ہے۔اِس مسئلے کو اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں نے خُوب اُچھالا۔پر نتیجہ کُچھ نہیں نِکلا۔کیونکہ دونوں جانب دیش بھگتی اور غداری کی بیماری انسانی ذہن و دِل پر کینسر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔رابعہ اور صوفیہ کیلئے زندگی بڑی بے رحم بن گئی تھی۔بوڑھا سرپنچ اُسے دلاسہ دیتا اور کہتا کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''واہیگورو نے چاہا تو تم دونوں ماں بیٹی جلد سرحد پار جاؤ گے''۔سرپنچ کو یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اگر ماں پاکستانی ہے تو اس کی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹی کیسے ہندوستانی ہو گئی۔وہ سوچتا کہ اگر کوکھ پیدائش کا پیمانہ نہیں تو جالندھر اور دہلی میں پیدا ہوئے کیسے پاکستان کے حاکم بن گئے اور جہلم اور چکوال میں جنم لینے والے کیسے ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے۔کیا حدیں اور سرحدیں اُن لوگوں کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتیں۔کیا قانون اور ضابطے سب غریبوں کے لئے ہوتے ہیں۔رابعہ کی حالت دیکھ کر بوڑھا سرپنچ پریشان تھا مگر بے چارہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔اس نے رابعہ اور صوفیہ کو گھر میں پناہ دے رکھی تھی لیکن پل کنجری گاؤں کی زمین میں سوراخ، بِل اور درزیں زہریلے سانپوں سے بھری پڑی تھیں اور پھنئیر سانپ اپنی بِل سے پھُنکاریں مارتے رہتے تھے۔بوڑھا سرپنچ جانتا تھا کہ بھیڑیئے ایشور کا نام لیکر شکار نہیں کرتے ،اسلئے وہ چوکنّا رہتا لیکن سانپوں کا کیا بھروسہ۔ایک دن وہ واہگے بارڈر گیا اور افسرِ اعلیٰ سے ملا اور کہنے لگا۔

''رابعہ اور اس کی بیٹی کی ذمے داری وہ اب نہیں سنبھال سکتا۔اُنہیں کسی یتیم خانے یا کسی آشرم میں بھیج دیں تا کہ رابعہ کی عزّت بچی رہے،کیونکہ میرے اردگرد بھیڑیں بھی کالی ہیں

اور بھینسیں بھی''۔

رابعہ ٹھوکریں کھا کھا کراب سیانی ہوگئی تھی۔ وہ ماحول میں پھیلی جنسی آلودگی کو سونگھ سکتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اُس کے آگے آگ اور پیچھے پانی ہے۔ بُرے مقدر کے تھپیڑے سہہ سہہ کر اُس مسکین کا اندر کھنڈر بن چکا تھا۔ وہ اب جان چکی تھی کہ جب تک اس میں دم ہے، غم اس کا پیچھا نہیں چھوڑنے والا۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر رابعہ نے پھر ایک فیصلہ لیا۔۔۔۔اس نے سوئی ہوئی صوفیہ کو گلے لگایا۔ اُسے چوما، پیار کیا اور پھر اندھیری رات میں سرپنچ کے گھر سے نکل پڑی۔ دوسری صبح اُس کی لاش پُل کنجری کے اُسی کنوئیں سے برآمد ہوئی جسے رانی موراں نے بنوایا تھا۔ ماں کی لاش دیکھ کر صوفیہ رونے لگی۔ گاؤں کی عورتیں اُسے چپ کرارہی تھیں اور خود بھی روئے جارہی تھیں۔ گاؤں والوں نے رابعہ کو پُل کنجری کے بے چراغ قبرستان میں دفنا دیا۔ صوفیہ اکیلی رہ گئی۔ بوڑھا سرپنچ معصوم بچی کی دِلجوئی کرتا۔ اُسے بہلاتا، سہلاتا اور سمجھاتا، لیکن ماں کی موت کا درد اس کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیتا۔ وہ چپ چاپ سرحد پر لگی کانٹے دار تار کو دیکھتی رہتی۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ رابعہ کون تھی؟ صوفیہ کون ہے اور کیوں ہے؟۔ ایک سوال، جس کا جواب کون دے۔

(مرحومہ مدیحہ گوہر اور شاہد ندیم کے نام)

●

کنواں اور کھائی

طاقت اور طاقت ور ہمیشہ کمزور لوگوں کا ہی شکار کرتے ہیں اور سماج کو اپنی چابک سے چلاتے ہیں۔ غریب اور مسکین لوگوں کا قافیہ حیات تنگ کرتے رہتے ہیں۔ کمزور اور نادار لوگ گھروں کے اندر چھُپ کر پھکڑ تو لتے رہتے ہیں اور لفظوں کا چہرہ زخمی کر کے اپنا من ہلکا کرتے ہیں۔ وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بلِاشک وہ اپنی اُمیدوں، خواہشوں اور حسرتوں کے چراغوں سے اپنے گھر روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اُنکے نصیب کا اندھیرا دُور نہیں ہوتا۔ اُن کے سروں کی دستار پیروں میں خوار ہوتی رہتی ہے۔ لوگ چاہے اپنی اپنی پسند کے موسم میں جینا چاہتے ہیں مگر جی نہیں سکتے، کیونکہ اُنکی خواہشوں کا بالن ہمیشہ گیلا ہی رہا ہے۔ وقت کے جبّر نے اُنکا جینا حرام بنا دیا ہے۔ حاکم، عوام کو اپنا غلام بنانے کے لئے طاقت کے ساتھ ساتھ فنکاری، مکاری اور عیاری سے بھی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ حاکم کے حُکم مطابق لوگ سروں پر پگڑی نہیں باندھ سکتے بلکہ گلے میں صافہ اور مونہہ میں گھاس کا تنکا رکھتے ہیں۔ آزادی میں غلامی کی یہ رسم آج بھی چلتی ہے اور نہ جانے کب تک چلتی رہے گی۔ چنڈالوں اور سیاسی دلالوں کی چالوں کی وجہ سے آزادی ایک جُرم کی طرح اُنکے نام لکھی گئی ہے۔ اندھا پیسے اور کُتا چاٹے والی سرکار ہے۔ جہاں صرف تاریکی ہے۔ روشنی کا نام ونشاں نہیں۔ آج سادھ جھوٹا اور چور سچا ہے۔ اس ماحول میں کوئی بھی اپنے دِل کی زمین میں خوشی کے پھُول کیسے اُگا سکتا ہے۔ چاروں طرف بارُود کا دُھواں، گرد وغبار، آندھی، سُنامی، آگ کے شُعلے، شور شرابا اور لاشوں کی سرانڈ نے وحشت پھیلائی ہوئی ہے۔

دومُنہہ والے سانپ اکثر لوگوں کو ڈستے رہتے ہیں۔ٹوٹے دِلوں کی چیخیں اُنکا ماتم کرتی ہیں اوراُن ماتمی چیخوں نے اُس گاؤں میں بھی گریہ زاری وکُرلاہٹ پیدا کردی تھی، جہاں کئی عورتوں کی عزّت لوٹی گئی تھی۔حاکم کے حواریوں نے مِلی ٹینٹوں اور باغیوں کو پکڑنے کیلئے پورے گاؤں کو گھیر لیا تھا۔ ساری بستی میں کریک ڈاؤن لگا دیا گیا تھا۔ایک جہان لاوڈ اسپیکر پر اعلان کررہا تھا کہ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر آجائیں اور سکول کے میدان میں جمع ہوجائیں کیوں کہ اُن کے مکانوں کی تلاشی لینی ہے۔اور اُگروادیوں کو پکڑنا ہے جو گاؤں میں چھپے ہیں۔عورتیں اور بچے اپنے گھروں کے اندر رہ سکتے ہیں ۔سبھی گاؤں والے سکول گراؤنڈ میں جمع ہونے شروع ہوگئے۔وردی پوشوں نے اُنھیں گھیر لیا۔چار جیپوں میں نقاب پوش مخبر بیٹھے تھے جن کے سامنے گاؤں والوں کی شناختی پریڈ ہونے لگی۔جِس شخص کی طرف نقاب پوش اُنگلی اُٹھاتے ،اُسے پکڑ کر بکتر بند گاڑیوں میں بٹھادیا جاتا۔کئی گھنٹوں تک یہ کاروائی چلتی رہی۔

دوسری جانب شیُر جوانوں کے دو جتھے گاؤں کے گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے رہے۔بارہ سال کی بچیوں سے لیکر ستّر سال کی عورتوں کے انگ انگ ٹٹولتے رہے اور آپس میں ہنستے رہے۔ان کِھلی کلیاں،تازہ کِھلے اور مُرجھائے پھولوں کو خوب روندا گیا۔ایک قہر ٹوٹا تھا۔ فاختائیں شکار ہوگئی تھیں۔معصوم جوبنوں،ابلا جوگنوں اور ابھاگن سہاگنوں کا ذائقہ چکھنے کے بعد شیر جوان سکول کے میدان میں آگئے۔کریک ڈاؤن ختم ہو چکا تھا۔حاکم کے حواری اپنا کام مکمل کرکے جاچکے تھے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے۔

گھروں کے اندر داخل ہوتے ہی اُنہوں نے اپنی ماوؤں ،بہنوں،بچیوں اور بیویوں کی

چوڑیاں ٹوٹی ہوئی دیکھیں۔ کپڑے۔۔۔تار، تار اور خون آلودہ تھے۔ سبھی عورتیں اپنی شرم اور ننگے پن کا ماتم کررہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر بے بس اور مجبور گاؤں باسی رونے لگے، چلّانے لگے اور گاؤں میں آئی سُنامی کا ماتم کرنے لگے۔ اپنے نصیبوں کا ماتم، اپنی بے بسی اور بدحالی کا ماتم۔ اُن کے آنسوؤں کا پانی آنکھیں جلانے لگا۔ دُکھ، درد، اُداسی، مایوسی اور ذِلت نے اُن لوگوں کی سانسیں روک لی تھیں کیونکہ قانون کی گردن بندوق کی نالی میں پھنسی ہوئی تھی اور انصاف بلّ اور چھلّ کے نیچے دبا ہوا تھا اور پرجاتنتر عوام کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ ہڑتالوں، جلوسوں اور جلسوں پر بارُود چھڑکا گیا تھا۔ دُکھ روتی لاشیں مِٹی چوم رہی تھیں اور بے نام جنازے بین کررہے تھے۔ گاؤں کے کم سِن، جوان اور عمر رسیدہ لوگوں کے اندر غُصے اور کرودھ کا آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ کسی کی ماں کی عزت لُٹی تھی۔ کسی کی بہن کی نتھنی کھُلی تھی اور کسی کی بیٹی اُجڑی تھی۔

زبردستی سلام پنڈت کی بڑی بہن اور ماں کے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ کچھ دِنوں تک ماحول غضب ناک رہا۔ پھر گاؤں کے کُچھ جیالے نوجوانوں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ مِلی ٹینٹوں کے سرپرستوں سے ملے جنہوں نے اُنھیں اُلٹی پٹی پڑھائی اور اُنکے ذہن پراگندہ کردیئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہتھیار کسی کے یار نہیں ہوتے، وہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ لینے کے لئے سرحد پار چلے گئے۔ سرحد پار کرنے والوں میں سلام پنڈت بھی شامل تھا جو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور پیروں فقیروں کے طفیل خداوند کریم نے یہ میٹھا پھل اُنھیں دِیا تھا۔

وہاں اُنھیں نیلم وادی میں لگائے گئے ایک تربیتی کیمپ میں بھیجا گیا۔ ٹریننگ شروع ہوئی

۔ہتھیار چلانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے نئے نئے معنی بھی سمجھائے جانے لگے۔ بُنیاد پرستی کے منتر رٹائے گئے ۔ جنت کے خواب اور دوزخ کے عذاب کی کہانیاں سُنائی جانے لگیں۔ شہید اور غازی کے فلسفے بتائے گئے ۔ کافر اور مومن کے فرق بیان کئے گئے ۔ پر سلام پنڈت نے تو رُوح اور قلبوت کا پاٹھ پڑھا تھا۔ عرفان اور گیان میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں ۔ اُسکی روح صوفیوں، سنتوں، رشیوں، مُنیوں اور درویشوں کا مسکن تھی۔ وہ صرف اُن درندوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا، جنہوں نے اُسکی ماں اور بہن کی عِزت لُوٹی تھی ۔ ورنہ اُسے ملی ٹینٹ بننے یا تحریک میں حصہ لینے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تربیتی کیمپ میں جلد ہی اُکتا گیا، اور بے چین رہنے لگا۔ کیمپ میں ہتھیار چلانے کی تربیت دینے کے علاوہ لمبی لمبی داڑھیوں والے نام نہاد مولانا بھی آتے تھے جو نو جوانوں کو ورغلانے اور منفی باتیں سِکھانے کے علاوہ اُنکی سوچ اور عقل کو مقفل کرنے کی ترکیبوں پر عمل کرتے تھے ۔ سلام پنڈت کو کیمپ کا ماحول دیکھ کر یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ یہاں خوبصورت داڑھیوں کے اندر کالے آسیبوں کا بسیرا ہے۔ یہاں آزادی کی گردان گردانے کے پیچھے بربادی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔

سلام پنڈت کئی کئی راتیں جاگ کر گزارنے لگا۔ وہ خاموشی سے آسمان کو گھُورتا رہتا اور اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتا رہا۔ تربیتی کیمپ میں رہتے ہوئے بھی اُسکی آنکھیں روز ہجرت کرتیں اور اپنے گھر کا طواف کرتی رہتیں ۔ ماں، بہن اور باپ کی یاد آتے ہی اُسکی سانسیں اُکھڑنے لگتیں اور آنکھیں چھلک پڑتیں۔ وہ سوچتا کہ وہ کُنویں سے نکل کر کھائی میں پھنس چُکا ہے ۔ کیمپ میں لوگوں کا وطیرا دیکھ کر اُسکے اندر کا سمندر جوار بھاٹا کا شکار ہو جاتا۔ یہاں جیسی

سنگت تھی ویسی ہی رنگت بھی تھی۔ یہاں سلام پنڈت کو، لوگوں کے گھر جلا کر آگ سینکنے والی مخلوق ملی۔ اُنھیں کون سمجھاتا کہ جو ہتھیار زخم دیتے ہیں اُنھیں آخر زنگ لگ جاتا ہے۔ سلام پنڈت کے لئے بہت مُشکل دِن آئے تھے۔ دُکھوں کی سُنامی میں وہ ڈُوب چکا تھا۔ اُسکا من کیمپ سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ وہ کیمپ چھوڑ کر گھر واپس جانا چاہتا ہے۔ اِس بات کی اطلاع جب کیمپ کمانڈر اور خفیہ اداروں کو ہوئی تو اُسکی خوب پٹائی کی گئی۔ اُس پر گندے اور بدبودار الفاظ کے پتھر مارے گئے لیکن اُس نے کیمپ سے بھاگنے کا من بنالیا تھا کیونکہ اُن کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ خود کو اکیلا محسوس کرتا اور رات بھر روتا رہتا۔ اُسکے من کی سوندی مٹی گیلی اور کیچڑ آلود ہو چکی تھی۔ اگلی صبح، فجر کی نماز سے قبل وہ کیمپ چھوڑ کر شاردا کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا تا کہ وہ کشن گنگا کو پار کر کے ٹیٹوال کے جنگلوں میں چھپ کر رات ہونے کا انتظار کر سکے مگر تبھی ایک اور جتھا گائیڈ کی رہبری میں کیمپ پہونچا۔ اُن نوجوانوں میں سے ایک لڑکے نے سلام پنڈت کو اُسکے باپ کی چٹھی دی جس میں لکھا تھا کہ وہ گھر واپسی کے بارے میں بالکل نہ سوچے کیونکہ پولیس اور فوجی مُشکی کُتوں کی طرح اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ سرحد کے اِس طرف آتے ہی مخبر اور اِکھوانی اُسکی مخبری کر دیں گے اور اُسے مار دیا جائے گا۔ اسلئے وہ گھر واپس آنے کی بھُول ہرگز نہ کرے۔ وہ لڑکا سلام پنڈت کا ہمسایہ تھا۔ اُس نے سلام کو بتایا کہ پولیس والے اُسکے باپ کو کئی بار پکڑ کر لے گئے تھے۔ اُسے اذیتیں بھی دی گئیں۔ اُسکے گھر والوں کا جینا حرام بنا دیا گیا ہے۔ مخبر اکھوانی اور خفیہ ادارے سلام کی کھوج میں جگہ جگہ چھاپے مارتے رہتے ہیں اس لئے واپس جانا موت کو دعوت دینا ہے۔

سلام پنڈت بڑا پریشان تھا۔ اُسے گھر والوں کی فکر لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے اُجڑے گھر کو پھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ اپنی جنت سے فساد، ڈر، خوف، ناانصافی اور بے بسی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرحد کی لکیروں کی وجہ سے اُسکے رشتے اپنی زمین سے ٹوٹ جائیں۔ کیونکہ پسِ دیوار پردیس ہی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جلد سے جلد اپنے رشتوں کی ڈور کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن باپ کی چھٹی نے اُسکی اُمیدوں کی ہانڈی توڑ دی تھی مگر یہ بات پکی تھی کہ وہ تربیتی کیمپ میں بالکل نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انتہا پسندی اور خون خرابے کی دشمنی خوف ناک ہوتی ہے ۔ جبھی تو وہ موقع ملتے ہی کیمپ سے بھاگ گیا اور ساری رات چلتا رہا اور تڑکے تنبولی قصبے میں پہنچ گیا۔ وہاں اُسکی ملاقات ایک دوشیزہ سے ہوئی جو کسی سکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی ۔ سلام پنڈت نے اُسے اپنی رُوداد سُنائی۔ گورا چِٹا اور خوبصورت جوان دیکھ کر اُس لڑکی کو سلام پر ترس آ گیا اور وہ اُسے اپنے گھر لے آئی۔ اُسکا نام زینب تھا اور اُسکے والد کا نام رحیم بخش ______

رحیم بخش نے کُچھ سیاسی سفارشوں سے اور کچھ پیسوں کی بارشوں سے سلام پنڈت کی خلاصی کرائی ۔ رحیم بخش نے سلام پنڈت کو کاروبار کرنے کا مشورہ دیا اور اُسکی مالی امداد بھی کی ۔ رحیم بخش کے مشورے سے سلام نے تنبولی میں ہی کریانے کی دُکان کھول لی جس میں گاؤں والوں کی ضرورت کا سبھی سامان رکھ لیا۔ سلام پنڈت کا کام آہستہ آہستہ چلنے لگا اور مہاجنوں کے اس مقولے پر پورا اُترنے لگا کہ پہلے سال چٹّی ، دوسرے سال ہٹّی (دوکان) اور تیسرے سال کھٹّی یعنی آمدن۔ سلام کی دُکان اب نفع میں جانے لگی تھی۔ وہ

زینب اور رحیم بخش کا شکر گذار تھا، جن کی محبت و شفقت اور مالی مدد سے سلام پنڈت اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا تھا۔ سلام پنڈت اکثر اُنکے گھر جاتا۔ زینب کے ساتھ مل کر اُسے بڑا سکون ملتا۔ دھیرے دھیرے محبت اور شفقت کا یہ رشتہ، رشتے داری میں تبدیل ہو گیا۔ سلام اور زینب کی شادی ہو گئی، اور دونوں سُکھی جیون گذارنے لگے۔ اُسکے ہاں دو بچے عمران اور آمنہ پیدا ہوئے۔ دِن مزے میں گذر رہے تھے۔ پاکستانی انتظام والے کشمیر میں رہتے ہوئے سلام کو تقریباً بیس سال بیت چکے تھے۔ اُس کے بچے آٹھویں اور نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ کئی بار سلام اپنے بیوی بچوں کے فوٹو سرحد آر پار کرنے والے مجاہدوں کے ہاتھ اپنے والدین کو بھیجتا اور اُنھیں لِکھتا کہ اُسکی واپسی کیلئے حالات ساز گار بنائے جائیں تاکہ وہ اپنے گھر لوٹ سکیں۔ لیکن ایسا کُچھ نہیں ہو سکا۔

ایک دِن سلام پنڈت اور زینب اپنے کسی رِشتے دار کی وفات پر ماتم پُرسی کیلئے لیپا وادی گئے تھے۔ واپسی پر پولیس نے سلام کو پکڑلیا اور تھانے لے گئی۔ تھانے سے اُسے مظفر آباد کے تفتیشی مرکز میں لے جایا گیا۔ رحیم بخش اور زینب پولیس کے بڑے افسروں اور ڈپٹی کمشنر سے ملے اور سلام پنڈت کی بے گناہی کے ثبوت پیش کئے لیکن اُنکی کسی نے نہ سُنی۔ زینب نے بڑے حاکموں کے دروازوں پر دستک دی مگر کُچھ نہیں بنا۔ تفتیشی مرکز میں سلام پنڈت کی خوب دُھنائی کی گئی۔ اُسکے ٹخنے اور بازو توڑ دیئے۔ اُسے سخت زخمی حالت میں مظفر آباد کے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب زینب اور رحیم بخش کو پتہ چلا تو وہ اُسے ملنے ہسپتال پہنچے لیکن اُنکو سلام سے ملنے نہیں دیا گیا______ کُچھ مدت بعد زینب کو اطلاع ملی کہ سلام پنڈت کو خُفیہ محکمے والے راولپنڈی لے گئے ہیں۔ زینب کی دُنیا لُٹ چکی تھی۔ بدبختوں نے اُسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب بھر دیا تھا۔ وہ خفیہ محکمے کے

ہر افسر کے آگے سوالی بنی پر اُسکی آس خالی رہی۔ اُسے ہر جگہ وحشی، درندے ہی ملے۔ وہ سوچتی تھی کہ شاید خدا انسان بنانے کا فن بُھول گیا ہے۔ پت جھڑ کے موسم نے اُسکے گھر آنگن میں ڈیرے جمالئے تھے۔ اُسکے بچے ہنسنا بھول گئے تھے۔ سلام کے بِنا وہ آدھی ادھوری بھی نہیں رہی تھی۔ اُسکا گھر ویران ہو چکا تھا۔ اُسکی اوبڑ کھابڑ زندگی نے زینب کے دِل کی کُٹیا جلادی تھی۔ سیکورٹی افسروں کا مکّر، فریب اور ذِلّت آمیز سلوک اُسکی روح کو نوچ رہا تھا۔ دُکھ، درد، بدبختی اور محتاجی رات دِن سایے کی طرح اُسکے ساتھ ساتھ چلتی۔ وہ راولپنڈی گئی اور خفیہ محکمے کے بڑے افسروں سے ملی اور کہنے لگی۔

"ہم نے آپکی نمازیں پڑھیں اور آپ نے ہمارے لوٹے توڑے۔ اُدھر کے حاکموں کے ظلم کی وجہ سے سلام پنڈت بیچارا اِدھر بھاگ آیا تھا۔ مگر آپ نے اُسکی جان عذاب بنادی۔ اُس نصیب جلے نے کیا کمایا اور کیا گنوایا۔ حاکم کی سرداری تو دونوں جانب ایک جیسی ہے۔"۔

"بی بی! اُس نے اپنا جرم قبول کیا ہے۔"

"سرکار! لاٹھی کے آگے تو بھوت بھی ناچتا ہے۔ اُس غریب کی اوقات ہی کیا ہے۔ لیکن آپ سچ کو آدر دینا کیسے سیکھیں گے۔ صاحب جی! سلام سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اُس نے کبھی قانون کی نافرمانی نہیں کی۔ وہ میرے ماتھے کا جھومر تھا۔ ہم دونوں مزدوری کر کے چُوری کھاتے تھے اور ربّ کا شکرانہ پڑھتے تھے۔ آپ نے ناحق سلام کو پکڑا ہے۔ سرکار! غریب مسکین کے آنسو اور کشتی کا چپو پاتال کو ہلا دیتا ہے۔ اسلئے خُدا کا خوف کھائیں اور سلام کو چھوڑ دیں۔ اُسکے جانے کے بعد ہمارے گھر میں بھُوک ناچنے لگی ہے۔ نہ چُولہے میں آگ ہے اور نہ گھڑے میں پانی ــــــــ یہ ہے ہماری زندگانی۔ صاحب جی!۔ زندہ لوگوں پر مٹی نہیں ڈالا کرتے۔ آپ چاہے پگڑی باندھو یا پٹکا، یہ دُنیا چار دِنوں کا لٹکا ہے۔ پھر سب نے قبروں میں بسیرا کرنا ہے۔ یہ رونا پیٹنا سب ختم ہو جائے گا۔ صِرف اللہ کا نام رہ

جائے گا۔ ہمارے یہاں مسلمان فرقوں، مسلکوں، لُوٹ کھسوٹ اور پھوٹ میں پڑ گئے ہیں اور اسلام کتابوں میں قید ہو چکا ہے۔ کِس کے آگے فریاد کی جائے۔ بھلا آک کے درخت پر بھی کبھی شہد لگا ہے۔ لیکن جب تک میرے دم میں دم ہے میں دم نہیں ہاروں گی۔ جب دم نہیں رہے گا۔ پھر کیسا غم۔ سرکار! آپ نے ایک بات مجھے سمجھا دی ہے کہ جبّر کے آگے صبر کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ پر میری بات بھی یاد رکھیں کہ قیامت والے دِن میدانِ حشر میں آپکا گریبان میرے ہاتھوں میں ہوگا۔

''بی بی! زیادہ بکواس مت کرو۔ تمہارے خاوند نے یہ بات لکھتی طور پر مانی ہے کہ وہ دشمن ملک کا ایجنٹ ہے اور اُسکی مخبری پر ہمارے کئی مجاہد شہید ہو چکے ہیں۔ اسلیئے ہم سلام پنڈت کو چھوڑ نہیں سکتے''۔

یہ بات سُن کر زینب بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی۔

''پر صاحب جی! اگر وہ دشمن ملک کا ایجنٹ اور جاسوس ہے تو پھر اُنہوں نے سلام پنڈت کو زندہ یا مردہ پکڑنے کیلیئے دس لاکھ روپے کا انعام کیوں رکھا ہوا ہے؟''۔

زینب کی دلیل سُن کر خُفیہ ادارے کا افسر ہکّا بکّا رہ گیا اور غور سے زینب کی جانب دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔

''میں اِس کیس کی انکوائری دوبارہ خود کروں گا لیکن ہمارے مخبر غلط بیانی نہیں کر سکتے''۔

کرم جلی زینب اپنا سب کچھ ہار کے اُٹھی اور بے بسی کی حالت میں جاتے جاتے کہہ گئی۔

''ہاں! آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ دونوں اطراف کے مخبر ہی سچ بولتے ہیں۔ باقی سب جھوٹ............''۔

●

زہرِ عشق

چکردار سیڑھیاں چڑھ کر اُسکی ٹوٹی پھوٹی، پلستر اُتری اور سیلن بھری کوٹھری کے اندر قدم رکھتے ہی من کو سخت صدمہ ہوا۔ چھت پر پڑے لکڑی کے بالے اپنی عمر بِتا چکے تھے اور اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔اُن میں کڑکڑ کی آواز آرہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں چارپائی پر پڑی گدلی عمر کی شاداں بلّی دمے کی دلدل میں پھنسی تسبیح پڑھ رہی تھی اور غفورا پہلوان چائے بنا رہا تھا۔ عاجزی اُداسی اور بے بسی اوڑھنے والے اِن دنوں میں اپنے بوڑھاپے کے چھیچھڑے شاداں بلّی کو کھِلانے کیلئے میں اُسکی کوٹھری میں آیا تھا تاکہ مونہہ ماری، خجل خواری اور آوارگی کے دِنوں کی راکھ کو کُریدسکوں۔ کیونکہ میں آج بھی اپنی من مستی میں رہنا پسند کرتا تھا جبھی تو دِلِ نامراد کا سفر مجھے شاداں بلّی کے حُجرے کی طرف لے آیا تھا جہاں میلے مکوڑوں اور بھُوری کیڑیوں نے ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔

شاداں بلّی کبھی جموں کے محلّہ جیون شاہ کی خوبصورت، سُریلی اور مٹھیلی گائیکہ تھی۔اُسکے سنگیت کا سُر منڈل اور آواز کا جلترنگ دِل کے اندر گھنٹیاں بجانا شروع کر دیتا تھا۔اُس کی کمل کٹوری اور کاجل کالی آنکھیں، دیکھنے والوں کیلئے تیر، تلوار، خنجر اور کٹار تھیں۔اُسکے دانتوں پر چڑھا دنداسہ، موتیوں جڑا تھا۔ وہ گوری، تن کوری ناری، گنّے کی گنیریوں کی طرح مٹھّیاری تھی۔اُسکے کنوارے ہاسے سننے والوں کیلئے بتاشے تھے۔ میں نے کئی بار اُس کی گنیریوں کا رس چُوسنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے تن کے کپڑوں پر داغ لگانے کیلئے تیار نہیں ہوئی۔ وہ تو سُر بھگتن تھی۔اُسے سُر کی پہچان اور راگوں کا گیان تھا۔ گانا اُسکا شوق بھی تھا اور روزی روٹی کا وسیلہ بھی۔سُر میں سجی اُسکی ٹھُمریاں، کافیاں، گیت، غزلیں، دادرے

اورخیال ،کمال تھے ۔سازوں کوسُر میں کرنے کیلئے سازندے ۔۔۔۔۔تان پورے ،
ستار،سرنگی ،سرود،ڈھولک اورطبلوں کی کھچائی ،کسائی ،رگڑائی اورٹھکائی کرتے رہتے تھے
اوررونق میلہ لگارہتا۔

شاداں بِلّی ایک سچی ،سچّی اورسجیلی نارتھی ۔اُس نے کبھی اُردوبازار کی کسبیوں کی طرح
ناز،نخرے نہیں دِکھائے ۔وہ کوئی رنڈی نہیں تھی کہ چلتے سکّے کی طرح گردش میں رہے۔کبھی
گاہک کے سر پر بیٹھے اورکبھی اُسکے پیروں میں ۔شاداں بِلّی نے کبھی کسی پرائے گھر کادودھ
نہیں پیا۔وہ ایک اصیل ڈیرے دارنی نصیبوکی بیٹی تھی جوجاگیردارسردارخان کی رکھیل تھی
اوررکھیل تو خالص سرسوں کاتیل ہوتی ہے۔اِس کڑوے تیل نے سردارخان کے نتھنوں
سے خُوب پانی نچوڑاتھا اورآنکھوں کودُھواں دیاتھا۔سردارخان نصیبوکے رنگ رُوپ
کامارَاتھا۔اُسے اپنی تڑپ کادارُونصیبوکے کوٹھے پرہی ملتاتھا کیوں کہ پکی رنگت اورکچی
سنگت والے گبھرُو جوان،گوری شکلوں کے عاشق ہوتے ہیں اورجلدہی اس کیچڑ میں
لتھڑے جاتے ہیں ۔ایسے عاشق رنڈی کے کُتے کے موُنہہ پرلگے شہدکوبھی چاٹنے کیلئے
تیاررہتے ہیں ۔دُنبے اورنیل کاچربیلا گوشت کھانے والے یہ عاشق قدکاٹھ نکالتے ہی
آوارہ گردی کی جُوتیاں پاؤں میں پہن لیتے ہیں اورجگہ جگہ بدکاری کی دُھول اُڑاتے رہتے
ہیں ۔عمر کے پکے رنگوں میں رنگی نصیبوبڑے گُن گیان والی عورت تھی ۔خاندانی ،کاروباری
اورشوقین لوگوں کی خُوب پہچان رکھتی تھی ۔لہذااُس نے خوشی خوشی سردارخان کی رکھیل بننا
قبول کرلیا۔شریرمیں اُبلتاخُون ہواورجیب میں کھنکتامال ہوتوشوق کے شگوفے آپ کھلنے
لگتے ہیں اورجسم میں رنگینی ناچنے لگتی ہے۔

سردارخان کے پاس نہ تو دولت کی کمی تھی اور نہ ہی شوق کے ذوق کی۔ اوپر سے نصیبو سیالکوٹ کے محلّہ رام تلائی سے جموں آئی تھی اور سیالکوٹیوں کے بارے میں تو یہ مقولہ مشہور ہے کہ سیالکوٹی۔۔۔حرام کی بوٹی۔ سردارخان نصیبو کی اُترن استعمال کرنے لگا۔ جوانی کی ترنگ میں رنگی نصیبو جاگیردار سردارخان کے ساتھ دِلداریاں کرتی۔ ہنسی، مذاق اور ناز نخرے کرتی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ جوبن، کوئی سدابہار باغ نہیں ہوتا۔ اِس لئے وہ سردارخان کی دولت اینٹھنے میں لگی رہتی۔ سردارخان عِشق مُشک والا گبھرُو تھا۔ جلد ہی اُسکے دامِ میں آگیا۔ وہ نصیبو کی سبھی ضرورتیں پوری کرتا، لیکن اُسکی صرف ایک ہی شرط تھی، اور وہ یہ کہ نصیبو اپنے جسم کا نمک کسی اور کو چکھنے نہیں دے گی، پر سردارخان کو کون سمجھاتا کہ پانی کی مچھلیاں سارے مچھیروں کے لئے ہوتی ہیں، کسی خاص شخص کے لئے نہیں۔ اُسے کون بتاتا کہ کوٹھا چاہے فقیر کا ہو یا ڈیرے دارنی کا، دونوں کا مقصد لوگوں کی دِل جوئی کرنا ہوتا ہے۔ جبھی تو کوٹھے اور چوبارے بے اعتبارے ہوتے ہیں۔ اِن کوٹھوں میں بے غیرتی، بدلحاظی اور مایاجال کے جگنو جلتے بجھتے رہتے ہیں ____ خُدا جانے نصیبو نے کِس کبوتر کا چوگا چُگا تھا کہ اُسکے پاؤں بھاری ہو گئے اور پیٹ باہر نکل آیا۔ اُس نے شاداں بِلّی کو جنم دیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ تحفہ سردارخان کا ہی دیا ہوا ہے۔ پھر بھی جنم دینے کے بعد نصیبو نے باپ کا خانہ خالی رکھا تھا تاکہ کوئی شاداں پر اپنا حق نہ جتا سکے۔ نصیبو کو بھروسہ تھا کہ آنے والے کل کو شاداں اُسکے کوٹھے پر چاند کی طرح چمکے گی اور سورج کی طرح روشنی بکھیرے گی اور اُسکے بوڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ اِس لئے نصیبو شاداں کے پالن پوسن میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ شاداں کو سُر سنگیت کا سبق دیا جانے لگا۔ اندور، گوالیار، شام چوراسی اور پٹیالہ گھرانے کے گُنی اُستاد اُسے سُروں کا ست رنگی جھولا جھولاتے۔ اُسے سنگیت کلا کی

باریکیاں سمجھاتے ۔ راگوں کا گیان دیتے ۔شاداں بھی من لگا کر سیکھنے لگی اور دھیرے دھیرے اپنی پہچان بنانے لگی۔ اب کبھی کبھی وہ اپنی ماں نصیبو کے ساتھ مُجرے میں بھی سنگت کرنے لگتی۔

پھر وہ وقت آ گیا جب نصیبو سُر سے بے سُری ہونا شروع ہوگئی۔اُس کی آواز کی بُلبل نے کُو کنا بند کر دیا۔ وہ نصیبو جو اپنے عاشقوں کیلئے مصری کی ڈلّی تھی ،آج اُس کے کھیت کی گرداوری لگانے کیلئے کوئی پٹواری تیار نہیں ہوتا تھا۔سبھی اُس سے کترانے لگے تھے۔اب اُسکی عمر چاولوں میں پتھر چُننے کی ہوگئی تھی اور شاداں بِلّی کی عمر ،جسم پر اُبٹن ملنے، ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگانے ،طِلّے دار پراندے سجانے ،گوٹے کناری والے دوپٹے اوڑھنے اور ہار شنگار کرنے کی۔ پکی پیلی نصیبو کا جسم بھی اب پکے پپیتے کی طرح تھلتھلانے لگا تھا ۔اُس نے اپنی اور پرائی آگ خُوب سینک لی تھی اور نرک کے تینوں دوار پار کر آئی تھی۔جبھی تو گاہے بگاہے پلنگ پر بیٹھے اپنی موج میں وہ اکثر لوک گیت گاتی رہتی۔ جیسے

؎ وگ وگ توی دیا پانیاں　　　تیرے شہر وِچ موجاں مانیاں

؎ بول مِٹی دیا باویا　　　تیرے دُکھاں کلیجہ ساڑھیا

یا پھر

؎ مٹی دے کھڈونے　　　گھڑی پل دے پروہنے

وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ چُپ چاپ گذر جاتا ہے اور ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔نصیبو بھی ماضی کا حِصہ بن چکی تھی اور یہ کھلونا اب پل بھر کا مہمان تھا۔ پھر ایک دِن وہ دُھول کے غبار میں گُم ہوگئی اور چوبارے کی چوہدراہٹ شاداں بِلّی کے ہاتھ آ گئی

۔سُر سنگیت کی محفلیں دوبارہ سجنے لگیں۔ سازندے اور ساز دوبارہ بجنے لگے۔
آواز کا جلترنگ پھر جوبن پر آگیا۔ دِل کے گھونسلے میں سُریلے پنچھی دوبارہ چہچہانے لگے اور رونقیں بڑھنے لگیں ____ اِس رنگا رنگ میلے میں گُڑا اسلا تھیاں کا ایک سِر پھرا، اڑیل اور سڑیل جوان گجے سنگھ چاڑک بھی شاداں بلّی کے چوبارے پر آنے لگا۔ وہ چڑھتی جوانی کے خُمار میں شاداں پر اپنا حق جتلانے لگا۔ وہ بدشکل راجپوت، کُنالی میں موت تھا۔ اِس لئے شاداں بلّی کو اپنی جاگیر سمجھنے لگا اور اُس پر حُکم چلانے لگا کہ وہ اُسکے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں گائے گی۔ وہ کِسی کو بھی شاداں کے چوبارے پر چڑھنے نہیں دیتا تھا۔ ہر کسی کے ساتھ لڑنے جھگڑنے لگتا۔ مار کُٹائی کرنے لگتا۔ کئی بار اُسے پولیس پکڑ کر بھی لے جاتی مگر پھر بھی وہ باز نہیں آتا۔ وہ شاداں بلّی سے کہتا، ''یہ چوبارہ بے شک تمہاری جاگیر ہے لیکن تم میری جاگیر ہو۔ میری سوہنی، میری سسّی اور میری ہیر ہو۔'' ____ گجے سنگھ چاڑک عجیب سِر پھرا بندہ تھا۔ بس یوں کہہ لیں کہ پل میں پھٹکری اور پل میں بتاشا۔ وہ اُسے طعنے دیتا۔ اُسکا مذاق اُڑاتا۔ ڈانٹ پھٹکار کرتا اور نشے میں گالیاں بکتا رہتا۔ شاداں بلّی اُس سے سخت بیزار و لاچار ہو چکی تھی۔ اُسکا جیون اجیرن بن چُکا تھا۔ گو، ہر عورت کی جوانی کے رنگوں کو من بھاونے مرد کے لمس کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اُسکی رنگت نِکھرے لیکن گجے سنگھ چاڑک ایسے کٹھور سبھاؤ والے شخص کو شاداں ایک پل کیلئے بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔گجے سنگھ کے شریر میں واشنا کا کُتا بھونکتا رہتا تھا۔ اُسکی نظریں ناپاک اور پلید تھیں اور یہ بات شاداں کو ہرگز منظور نہیں تھی۔ وہ کسی بھی حالت میں گجے سنگھ چاڑک جیسے منحوس شخص کے مٹکے سے کھٹی چھاچھ نہیں پی سکتی تھی۔ شاداں حُسن و جمال کی مالک اپنی توہین برداشت

نہیں کرسکتی تھی ۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ بارش سے بچے اور پرنالے کے نیچے بیٹھ جائے ۔لہٰذا ایک دِن اُس نے گجے سنگھ چاڑک کو کھری کھری سُنا ڈالیں۔ بھلا صبر اور جبّر میں دبا ہوا جذبہ تلخیوں کو ہی پالتا ہے۔وہ کہنے لگی۔

”تم میرے لئے نہ تین میں ہو اور نہ تیرہ میں۔ اپنا مونہہ دیکھو۔نہ شکل نہ عقل ۔خبردار، جو دوبارہ میرے چوبارے کی دہلیز لانگھی ۔اگر پھر کبھی یہاں آئے تو غفورے پہلوان سے تمہاری ٹانگیں تڑوادوں گی۔وہ تمہاری گردن کے منکے توڑ ڈالے گا اور تم ہمیشہ کے لئے اپاہج بن کے چارپائی پر پڑے پڑے مرتے ،سڑتے رہو گے۔جاؤ، اپنے گھر کی جنت سنبھالو اور باہر کے دوزخ سے دُور رہو۔چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

غفورا پہلوان شاداں بِلّی کا خاموش شیدائی تھا۔اور اُسکی آواز کا عاشق ۔وہ ہمیشہ شاداں بِلّی کو ”سُر کی سرکار“ کہہ کر بُلاتا اور اُسکا ہر حکم بجالاتا۔غفورا پہلوان ،مالک کے آگے سالک تھا۔سالک کے آگے بالک تھا اور بالک کے سامنے چاکر بن کر شاداں بِلّی کی خدمت کرتا تھا تاکہ اُسکا رانجھا راضی رہے۔اُسے کسی معاوضے کی ضرورت نہیں تھی۔وہ تو شاداں کے چوبارے کی سردل کا اردل تھا۔غفورے کے من کے سنگھاسن پر شاداں بِلّی کے سُر منڈل کا راج تھا۔پر گجے سنگھ بھی چاڑکوں کا بگڑا پُوت تھا،وہ کِسی بھی قیمت پر شاداں کو چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ کالی رات کی چادر میں ہر شے کالی ہوتی ہے اور ایک نہ ایک دِن وہ بھی شاداں کی کالی چادر خود پر اوڑھ لے گا لیکن بھرم پالنے سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔بھرم بھیدوں کا تو کوئی علاج نہیں ہوتا۔

پھر یوں ہوا کہ شاداں بِلّی کے جیون بھون میں ایک بھُونچال آگیا۔اُسے من پسند ماہی مِل

گیا جس کا نام یوسف تھا اور جو یوسف کی طرح ہی بہت خوبصورت تھا اور جسکے چہرے پر آنکھ ٹکتی ہی نہیں تھی۔ پھِسل پھِسل جاتی تھی۔ جلد ہی یوسف شاداں بِلّی کے دِل کا رباب بن گیا۔ اُسکا سرگم۔ وہ خود بھی اچھا گلوکار تھا اور سُروں کے سروّر میں ہی پلا بڑھا تھا۔ دونوں کا شوق سانجھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یوسف صرف صوفیانہ کلام ہی گاتا تھا جبکہ شاداں بِلّی کو گاہکوں کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا اور ہر طرح کی گائیکی کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا۔ یوسف کی سنگت کی بدولت شاداں کو بابا فرید، شاہ حُسینؒ، سلطان باہو، وارث شاہ، بُلھے شاہ اور میاں محمد بخش جیسے صوفیوں کا کلام زبانی یاد ہو گیا تھا۔ اِن صوفی شاعروں کا کلام سُن کر اور گا کر شاداں بِلّی کو روحانی سکوُن ملتا۔ اُسکی روح کی مٹکی سوکھی پڑی تھی پر اُسے کنویں کی تلاش نہیں کرنی پڑی بلکہ کنواں تو خود اُسکے پاس چل کر آیا تھا۔۔ یوسف کے رُوپ میں۔ جسکی وجہ سے شاداں سسّی کی طرح جل تھل ہو گئی تھی۔ اب اُسکے دماغ کو دِل کی رکھوالی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ وہ اب بہت خوش تھی ____ لیکن گجے سنگھ چاڑک شاداں بِلّی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اکثر اُسے تنگ کرتا رہتا۔ وہ عقل کا موٹا اور سُلوک کا کھوٹا تھا اور پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے سے باز نہیں آتا تھا۔ مغروری اور امیری کے نشے میں چُور وہ کئی بار جیل بھی جاتا۔ جیل میں ہی اُسے شاداں بِلّی اور یوسف کے تعلقات کی خبر مِل چکی تھی ____ جب وہ جیل سے باہر آیا تو اُسکی کھوپڑی کی کوٹھری میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ سیدھا شاداں بِلّی کے چوبارے پر گیا جہاں شاداں اور یوسف ریاض کر رہے تھے۔ گجے سنگھ نے چاقو کے پھل سے یوسف کا پھیپھڑا پھاڑ دیا۔ یوسف جان کنی کی حالت میں پھڑ پھڑانے لگا اور آہستہ آہستہ اُسکی پھڑ پھڑاہٹ ختم ہو گئی اور وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ یوسف کو موت کی گود میں جاتے دیکھ کر غفورے پہلوان سے رہا نہ گیا۔ اُس نے ٹوکے کے ایک ہی وار سے

گجے سنگھ چاڑک کی گردن جسم سے الگ کردی ،اور یوسف کا حساب برابر کردیا۔
غفورا پہلوان بھی پٹھان کا پُوت تھا ۔پل میں ولی اور پل میں بُھوت تھا۔ وہ ٹوکا لیکر خود تھانے میں چلا گیا اور سارا ماجرا بیان کیا۔مُنشی نے پرچہ کاٹا اور غفورے کو حوالات میں بند کردیا۔غفورا پہلوان دِل گُردے کا اتنا پکا تھا کہ دُکھ تکلیفیں بھی اُسکے گلے پڑنے پر شرمسار ہو جاتیں ۔اُسکی زندگی تو شاداں بلّی کی بندگی تھی ۔اس لئے اُسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا___ میں اُن دنوں سِٹی تھانے کا تھانیدار تھا اور سارے کیس کی تفتیش میں خود کررہا تھا ۔تب تفتیش کے سلسلہ میں مجھے کئی بار شاداں بلّی کے چوبارے میں جانا پڑتا۔تفتیش کے دوران ہی نصیبو اور اپنی ذات سے وابستہ کہانی شاداں نے مجھے خود سُنائی تھی۔ اُسکی خوبصورتی اور مترنم آواز پر میں بھی مر مِٹا تھا۔میں نے کئی بار شاداں پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ مجھے پیش قدمی سے روک دیتی___ تفتیش مکمل کرنے کے بعد غفورے پہلوان کا چالان عدالت میں پیش کیا گیا ۔غفورے نے پہلی ہی پیشی میں اپنا جُرم قبول کرلیا اور اُسے دس سال کی سزا ہوگئی۔غفورا چُپ چاپ جیل چلا گیا۔شاداں بلّی کی دُنیا برباد ہوگئی تھی۔اُسے یوسف کی موت کا بڑا دُکھ تھا،کیوں کہ دونوں کے دِل ملے تھے اور دِلوں کے ملنے سے پیار کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور یہ کونپل شاداں بلّی کے اندر ایک پھلواری بن چکی تھی ،جسکی پتیاں اُسکے دِل میں ہری تھیں ۔ٹوُنے ،ٹوٹکے ،دھمکیاں ،مار کُٹائی اور قتل گردی سے عشق کا جِن کبھی نہیں نِکلتا۔۔۔مگر یہ بات گجے سنگھ کو کون سمجھاتا۔وہ اور یوسف ۔۔۔ایک ٹھیکرا اور دوسرا چاندی کا کٹورا،کوئی میل ہی نہیں تھا۔گجے سنگھ کی کرتُوت شاداں بلی کی دُنیا اُجاڑ چکی تھی،چاہے اُسکے ہاتھ بھی موت ہی آئی تھی___ شاداں غفورے پہلوان سے ملنے جیل جاتی ۔اُسکے لئے کھانا پکا کر لے جاتی

۔پھل لے جاتی۔عید کے کپڑے سِلوا کے دیتی۔وہ غفورے کا پورا خیال رکھتی۔وہ اُسے یہ محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ لاوارث ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ غفورا پہلوان ہی اب اُسکا کُل سرمایہ تھا۔

میں اکثر شاداں بلّی کے چوبارے پر جاتا۔میں نے دیکھا کہ شاداں کے دِل اور چوبارے کے سارے دیئے بُجھ چکے تھے۔ساز بے آواز ہو چُکے تھے۔اگرچہ جوانی کی دُھوپ ابھی تک اُسکے آنگن سے پوری طرح ہٹی نہیں تھی اور نہ ہی اُسکے سر کے بالوں میں چاندی کی کوئی تار دِکھ رہی تھی، پھر بھی اُسکا دِل بُجھتا جا رہا تھا۔بعدازاں میری تبدیلی الگ الگ علاقوں میں ہوتی رہی۔کبھی پونچھ، کبھی مظفر آباد، کبھی گِلگت اور کبھی لداخ ____ میری ساری نوکری گھر سے باہر ہی گذری۔میری بیوی نے سبھی گھریلو ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا۔بچوں کو پڑھایا، لِکھایا۔روزگار کے قابل بنایا۔دونوں بیٹیوں کیلئے اچھے رِشتے تلاش کئے۔ایک سُگھڑ بیوی کی طرح اُس نے خاندان اور رشتے داروں میں میری عزّت قائم رکھی۔میری آخری پوسٹنگ اننت ناگ میں ہوئی تھی، جہاں سے میں ضلع پولیس کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوا اور اپنے گھر جموں آ گیا۔بچے سب بیاہے گئے تھے۔کُچھ ملازم تھے تو کُچھ کاروبار کرتے تھے۔کوئی ودیشی بن گیا تھا تو کوئی سودیشی۔سب اپنی اپنی دُنیا میں مست تھے۔سرکاری نوکری سے فارغ ہونے کے تین سال بعد میری بیوی بھی فوت ہو گئی اور میں اکیلا پورے مکان میں بھُوت بن کر رہ گیا۔اکیلے پن کے ماحول سے باہر نکلنے کیلئے ہی میں شاداں بلّی کے چوبارے کی طرف گیا تھا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ شاداں بلّی نے چوبارہ کب کا بیچ دیا تھا اور پاس میں ہی ایک چھوٹی سی کُٹیا خرید کر اُس میں رہ رہی تھی

......اور جب میں چکردار سیڑھیاں چڑھ کر اُسکی کٹیا میں داخل ہوا تو وہ نماز سے فارغ ہوئی تھی اور تسبیح پڑھ رہی تھی۔ شاداں بلّی کا یہ روپ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اُس کا پورا جسم کپڑوں میں ڈھکا ہوا تھا، صرف چہرہ ننگا تھا۔ وہ پنج وقتی نمازن ہوگئی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے اندر کی ساری شوخیاں ختم ہوگئی تھیں۔ میں نے اُسے اِس نئے رُوپ کے بارے میں پوچھا۔ چوبارے کو بیچنے اور اِس سیلن والی کوٹھری میں رہنے کا سبب پوچھا۔ شاداں بلّی نے اپنی ماں نصیبو کے بول دوہراتے ہوئے کہا۔''۔

؎ مٹی دے کھڈونے گھڑی پل دے پروہنے''

پھر کہنے لگی، ''تھانیدارا! من مُرادمُرشد اور عاشق نصیب سے ہی ملتا ہے۔ مجھے مِلا تھا لیکن مقدّر نے ساتھ نہیں نبھایا''۔

''پر تُم نے گانا کیوں چھوڑ دیا۔ اپنا فن، اپنی کلاسکی اور کو کیوں نہیں سِکھائی ؟''۔

''میں پُرانی دیگچی تھی۔ مجھے کلعی کرانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میرا اندر کھنڈر ہو چُکا تھا۔ نفس کو پاک، شفاف بنانے کیلئے صفائی اور سُتھرائی کی ضرورت تھی اور مجھے معرفت کے نُور کی۔ اسلئے گانا بجانا بند کر دیا۔ ساز برباد کر دیئے۔ صرف صوفیوں کے کلام کو گیان، دھیان کی دُنیا کھوجنے کیلئے پڑھنا شروع کیا۔ قلندری رمزوں کو جب سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ انسانی قلبُوت کے اندر ایک دُنیا سمائی ہوتی ہے۔ ہر صوفی اپنے قلبُوت کے اندر کوٹھے اور حُجرے بناتے رہتے ہیں۔ جلال اور جمال والے صوفی راج، تاج اور سماج کی پرواہ نہیں کرتے۔ بس مولا سائیں کی درگاہ کے اندر تصّوف کی ست رنگی مدھوشالا میں مستی کی مدھرا پیتے رہتے ہیں۔ نماز، روزہ، زکات اور پُوجا پاٹھ سب ظاہری رُوپ ہیں لیکن ربّی عِشق

صوفیوں کے انتر من کو روشن کر دیتا ہے۔ پھر میں نے اپنی جیون ڈگر کو حقیقی عِشق کی جانب موڑ دیا۔ عِشق نے مجھے پاک اور صاف کر دیا اور اب..... ''اللہ ہُو دا آوازہ آوے، گلی نی فقیر دی وِچوں''۔

''تھانیدارا! درویشی اور فقیری سُوئی کے سوراخ میں سے اونٹ نکالنے والی بات ہے۔ اِس کا عِلم مجھے صوفیوں کا کلام پڑھ کے ہوا۔ غفورے پہلوان نے بھی جیل کے اندر ہی صوفی چولا پہن لیا تھا اور اللہ سائیں کے سنگ لو لگا لی تھی۔ خُود کو اوگن ہارا کہنے والا غفورا پہلوان اب گُن وان ہو گیا تھا۔ اُس کی ''سُر کی سرکار''..... اب صرف اُسکے لئے گاتی ہے۔ اِس فقیری چولے نے ہم دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ اب ہمارا الگ سے کوئی وجود نہیں ہے''۔

شاداں کی باتیں سُن کر میرے انتر من میں ایک جُوت جگنے لگی۔ میں نے شاداں بھگتن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مُجھے اُس کی آنکھوں میں رابعہ بصری کی مستی دِکھائی دی۔ للّہ عارفہ کے واکھوں کا دھمال دِکھائی دیا اور میرا بائی کے بھجنوں کا تیاگ۔ جس کوٹھری کو میں سیلن والی کہتا تھا، اُس میں پھیلی لوبان کی روحانی خوشبو سے میں نہال ہو گیا اور آج کل.....

''سانسوں کی مالا پہ سمروں میں پی کا نام''

●

زندہ آنکھوں کی داستان

میرے کوٹ کی جیبوں میں آنکھوں کے کئی جوڑے پڑے ہیں جو میری رُوح کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ اُنکی کسک میرے ذہن و دِل کو چُبھتی رہتی ہے۔ دائیں جیب میں پڑا آنکھوں کا جوڑا راج ناتھ راز دان کا ہے جو میرا لنگوٹیا تھا اور جِسے سن سنتالی میں قبائیلیوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ ایک گولی اُسکے سر کو دو پھاڑ کر گئی تھی۔ وہ تو مر گیا تھا لیکن اُسکی آنکھیں زندہ تھیں اور مُجھے گھُور رہی تھیں۔ مجھے بڑا ڈر لگا تھا۔ اپنے آپ سے .... قبائیلیوں کی دہشت گردی سے اور گاؤں میں پھیلی وحشت سے۔ مگر میں اُسے بچانے کیلئے کُچھ نہ کر سکا۔ بھلا چوتھی جماعت میں پڑھنے والا ڈرا سہا بچہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جماعتی راج ناتھ کی خُون آلود آنکھوں کو صاف کیا اور اپنی جیب میں ڈالا تا کہ یار کے پیار کی نشانی کو سنبھال کر رکھ سکُوں۔ آنکھوں دیکھے اِس سانحہ کی وجہ سے ایک لمبے عرصہ تک ہزاروں بچھو میری روح کو، میرے ضمیر کو ڈنک مارتے رہے اور میں درد سے کراہتا رہا۔

راج ناتھ راز دان کو مارنے کا واقع اجر میں ہوا تھا جو بانڈی پور کے بغل میں ایک گنجان آباد مگر بدحال گاؤں تھا۔ یہ سانحہ احمد شیخ کے کارن ہوا تھا۔ جسکی زمین کا جھگڑا سمسار چند راز دان کے ساتھ برسوں سے چل رہا تھا۔ احمد شیخ کی زمین سمسار چند کے کھیتوں کے ساتھ لگتی تھی اور وہ یہ زمین ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ سمسار پنڈت گاؤں کا ساہُوکار تھا اور لوگوں کو سُود پر پیسے دیا کرتا تھا۔ احمد شیخ نے بھی اُس سے سُود پر پیسے لے کر بیٹی کی شادی کی تھی اور اس سُودی رقم کے عوِض اپنی زمین سمسار چند کے پاس گروی رکھی تھی۔ احمد شیخ کے پاس نہ تو اصل رقم واپس کرنے کی سکت تھی اور نہ ہی سُود دینے کی گُنجائش۔

مقررہ وقت پر رقم واپس نہ کرنے کی صورت میں سمسار پنڈت نے اُس کی زمین پر زبردستی ہل چلانا شروع کر دیا تھا۔ بس یہ جھگڑا اُس کی اور اُس کے بیٹے یعنی میرے دوست راج ناتھ رازدان کی موت کا سبب بنا۔ احمد شیخ نے ہی سمسار چند کی مخبری کی تھی اور قبائیلیوں نے اُسے اور اُسکے پورے خاندان کو بے دردی سے مار ڈالا تھا اور اُن کی ساری جمع پُونجی لُوٹ کر لے گئے تھے۔ گاؤں کے بیشتر لوگ سمسار چند کی ساہُوکاری کا شکار تھے اور اُس سے دُکھی بھی تھے لیکن اِس خُونی واقع کے لئے وہ سب احمد شیخ کو قصور وار سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے احمد شیخ کا حُقہ پانی بند کر دیا اور اُس کے ساتھ سارے سماجی رِشتے ختم کر دیئے۔ اِسی وجہ سے احمد شیخ معہ عیال سرحد پار کر گیا اور پاکستانی انتظام والے کشمیر میں جا بسا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

میں نے بارہ مولہ کے سینٹ جوزف سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر شری پرتاپ سنگھ کالج سرینگر میں داخلہ لیا، جہاں سے بی، اے پاس کرنے کے بعد میں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ مُجھے پڑھنے لِکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اِس شوق نے میرے اندر شاعری کی چنگاری کو جنم دیا اور میں شعر کہنے لگا۔ جلد ہی میرا نام کشمیر کے ادبی حلقوں میں لیا جانے لگا۔ میرے مرحوم والد بھی اُردو اور کشمیری کے شاعر تھے اور قومی سطح پر جانے جاتے تھے۔ شاعری کا شہد شاید ابا مرحوم نے پیدا ہوتے ہی مُجھے چٹایا ہوگا یا پھر تُخم تاثیر کا اثر ہوگا، جبھی تو میں ایک شاعر بن گیا۔ میں نے اپنے بل بوتے پر آل انڈیا ریڈیو کا امتحان پاس کر کے پروگرام پروڈیوسر کی نوکری حاصل کی، اور اپنی ذمہ داریوں کو خُوب سے خُوب تر نبھایا اور آواز کی دُنیا میں نام کمایا۔ میں نے مُلک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں آکاش وانی اور دُوردرشن مراکز میں بحثیت پروگرام پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کام کیا

اور آخر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل دُوردرشن کے عہدہ سے سُبکدوش ہوا۔ اِس ساری سرکاری اور ادبی آوارہ گردی کے دوران میں اپنے یار راج ناتھ کو کبھی نہیں بھلا پایا۔ سرکاری کام کاج تو ہر کوئی کرتا ہے مگر جب بھی کِسی کشمیری پنڈت بھائی بہن کی مِسل میرے پاس آتی تو راج ناتھ کی تصویر میرے سامنے آجاتی اور خُون میں لت پت اُسکی آنکھیں، مُجھے فائل پر مُثبت لکھنے کے لئے میری قلم بن جاتیں۔ میں یہ بات پورے وثوق اور ذمے داری سے کہتا ہوں کہ میں نے کبھی کِسی کشمیری پنڈت کی مِسل نامنظور نہیں کی۔ کبھی اُن کا کام نہیں روکا۔ ہمیشہ اُن کی دادرسی کی اور دوسرے اداروں سے بھی اُن کے کام کرواتا رہا۔ کیوں کہ میرا اور اُن کا نسلی اور ثقافتی رشتہ تھا جسے میں کبھی نہیں بھُولا۔ ہر کشمیری پنڈت کے چہرے میں مجھے راج ناتھ راز دان نظر آتا جس کی موت کے لئے جانے کیوں میں اپنے آپ کو ذمے دار سمجھتا تھا۔

میرے کوٹ کی دوسری جیب میں جو آنکھوں کا جوڑا پڑا ہے، وہ میرے دوست، ہم پیالہ اور ہم نوالہ لسّہ کول کا ہے جو ریڈیو کشمیر سری نگر کا ڈائریکٹر تھا۔ ہم دونوں اکٹھے مدھُوشالا جاتے اور جام ٹکراتے۔ کشمیر کی سیاست، سیاسی جوڑ توڑ، غیر سرکاری اور کبھی کبھی سرکاری دہشت گردی پر باتیں کرتے اور سوچتے کہ بھارت سرکار سے 1947ء کے بعد وہ کون سی حماقتیں ہوئیں کہ وہ لوگوں کے دِل جیتنے میں ناکام رہی۔ اِن غلطیوں کو سُدھارنے کیلئے کون کون سے قدم اُٹھائے جانے چاہئیں ___ میں اُن دِنوں دُوردرشن سری نگر کا ڈائریکٹر تھا اور لسّہ کول ریڈیو کشمیر کا۔ ہم دونوں دُوردرشن اور ریڈیو کشمیر سے ایسے پروگرام پیش کرنے کی سوچا کرتے کہ جن سے کشمیری نوجوانوں کو دہشت گردی سے نجات مِل

سکے۔ لسّہ کول کشمیر اور کشمیریت کی علامت تھا۔ اُسکی دوستی ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائیوں کے ساتھ بڑی گہری تھی۔ اُسکے تعلقات افسر شاہی کے ساتھ بھی بہت اچھے تھے۔ وہ دراز قد، خوبصورت، ہنس مُکھ اور محفلوں کی جان تھا لیکن جنگجو اُسے بھارتی جاسوس اور مُخبر سمجھتے تھے اور اسی الزام میں اُسے ماردیا گیا۔ اُسکی آنکھیں ہمیشہ مُجھ سے پوچھتی ہیں کہ اُس کا قصور کیا تھا؟ میں کیا بتاتا کہ اِس دھرتی پر اکثر لوگ بے قصور ہی مارے جاتے ہیں۔ مُجھے خود پر غُصہ آتا۔ میں اُداسی اور بے بسی کی آگ میں جھلستا رہتا اور پھر شرمندگی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

محمد اعظم ساگر پونچھ کے پہاڑی ہوسٹل کا وارڈن تھا۔ اُس کا بیٹا نشاط اعظم اگریکلچر یونیورسٹی کانپور سے ایم، ایس، سی اگریکلچر کی ڈگری لے کر گھر آیا تھا۔ ایک دِن ساگر صاحب نے اُسے اپنے گاؤں نکا مجوڑی بھیجا تا کہ وہ مکئی کی فصل کی کٹائی کرا سکے۔ رات کو وہ اپنے گاؤں والے مکان میں سویا ہوا تھا کہ فوجی جنگجوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے ساگر صاحب کے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں نشاط کو اکیلا دیکھ کر اُسے سوتے میں آن دبوچا۔ نشاط نے لاکھ کہا کہ وہ جنگجو نہیں ہے بلکہ کانپور اگریکلچر یونیورسٹی سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے آیا ہے۔ اُس نے سارے ثبوت دیئے لیکن فوجیوں نے اُسکی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اُسے اُگروادی بنا کر بڑی بے رحمی سے ماردیا۔ پورے گاؤں میں اِس سانحے کے خلاف غُصہ بھڑک اُٹھا۔ فوج کے خلاف دھرنے دیئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ فوج کا اصرار تھا کہ اُنہوں نے کِسی بے گناہ کو نہیں مارا ہے بلکہ مرنے والا اُگروادی تھا۔ یہ خبر سرکاری ذریعے سے ہم نے بھی اپنے چینل سے چلائی تھی جِس کا نشاط کو بہت افسوس تھا۔ سرکار نے لوگوں

کو مطمئن کرنے کے لئے ایک انکوائری کمیشن بنایا، جسکی رپورٹ کبھی نہیں آئی۔ محمد اعظم میرا شاعر دوست تھا۔ اِس لئے نشاط کے جنازے میں شامل ہونے کے لئے میں خصوصی طور پر براستہ مُغل روڈ آیا تھا۔ جب نشاط کی میت کو قبر میں اُتارا گیا تو اُسکی آنکھیں کفن سے باہر نکل کر مجھے گھُورنے لگیں۔ گویا کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُسکی جھوٹی خبر دُوردرشن سے کیوں چلائی۔ میں کیسے کہتا کہ سرکاری فرمان کی نافرمانی سے نوکری چلی جاتی ہے اور پھر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نشاط کی آنکھوں کی برہمی اور خفگی میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے اُسکی آنکھوں کو ہاتھوں میں لیا اور کوٹ کی اوپر والی جیب میں رکھ دیا، اور شانت ہو گیا لیکن نشاط کی موت کا کرب ایک مُدّت تک مجھے ڈستا رہتا۔

میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں پڑی دو آنکھیں غلام حسین کی ہیں جو طوطا گلی کا رہنے والا تھا اور فوج کا مخبر تھا۔ وہ جنگجوؤں کے سخت خلاف تھا اور اُن کی نقل و حرکت کے بارے میں فوج کو آگاہ کرتا رہتا۔ جب اُسکی حرکات کا پتہ اُنھیں چلا تو جنگجوؤں نے اُسے خبردار کیا اور دھمکی دی کہ وہ باز آجائے ورنہ اپنی کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہے۔ غلام حسین کو فوج کی پُشت پناہی حاصل تھی لہذا اُس نے جنگجوؤں کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ خُود کو بھارت ماتا کا سچّا سپوُت سمجھتا تھا اور وقتاً فوقتاً دہشت گردوں کی جانب سے ہونے والی کارروائیوں اور اُن کے ٹھہرنے کے ٹھکانوں کی اِطلاع فوج کو دیتا رہتا۔ آخر ایک شب جنگجوؤں نے اُس کے گھر پر ہلّہ بول دیا اور غُلام حسین اور اُسکے بیوی بچوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ کِسی نے اُن کی فوتگی کا سوگ نہیں منایا۔ نہ بھارت ماتا کے سپوُتوں نے اور نہ ہی اُن کے رشتے داروں نے۔ جیسے انسان نہیں، کُتے مرے ہوں۔ غُلام حسین کی

آنکھیں یہ سلوک دیکھ کر بڑا تڑپیں۔ وہ مجھ سے گلہ کرنے لگیں کہ کیا دیش بھگتی کا صلہ ایسے ہی ملتا ہے؟۔ میں کیا کہتا۔ اِس طرح کی سرکاری اور عوامی بے رُخی کے کئی تماشے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اِس لئے میں نے غلام حُسین کی آنکھوں کو حفاظت سے کوٹ کے اندر والی جیب میں رکھ دیا۔

موضع ہرنی کے چار بے گناہ ہندوؤں کا قتل جنگجوؤں نے دِن دیہاڑے کیا تھا۔ لوگوں میں اِس واقع پر سخت غم وغُصّہ تھا۔ مینڈھر، پونچھ، سوُرن کوٹ اور راجوری سے ہندو برادری کے لوگ اس افسوس ناک سانحے کا سُن کر جوق در جوق ہرنی پہنچ رہے تھے۔ سرکار کے خلاف نعرے بازی ہورہی تھی۔ پُتلے جلائے جارہے تھے۔ فوج کو بدلہ لینے کے لئے اُکسایا جارہا تھا۔ میں اِس حادثے کی آنکھوں دیکھی سچائی کو دِکھانے کیلئے خود ہرنی پہونچا تھا۔ لوگوں سے پتہ چلا کہ پچھلی رات بلنوئی میں تعینات فوجی بٹالین کے کُچھ سپاہی شراب کے نشے میں سرحد عبور کرکے کسی شادی والے گھر کی چھت پر سوئے ہوئے چھ لوگوں کو مار کر اُن کے سر کاٹ کر لے آئے تھے؛ جس کا بدلہ جنگجوؤں نے ہرنی گاؤں کے چار معصوم ہندوؤں کا قتل کرکے لیا تھا۔ اُس گھر کا بزرگ کرشن لال مرتے مرتے اپنی آنکھیں میرے حوالے کر گیا اور کہہ گیا کہ کب تک ہم دُشمنیاں پالتے رہیں گے اور ایک دوسرے کے سر کاٹتے رہیں گے۔ کیا ہم سرحد کے آر پار خوش بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ سُکھ سندیس اور خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے۔ میں نے کرشن لال کی آنکھوں کو کوٹ کے اندر والی دوسری جیب میں رکھا تا کہ جب کبھی سرحد پار کی دُکھ سہتی آنکھیں مُجھے ملیں تو میں کرشن لال کی آنکھوں کو اُن سے ملاؤں اور وہ دونوں اپنا درد سانجھا کرسکیں۔

میرے کوٹ میں چھوٹی بڑی اور بھی کئی جیبیں ہیں، جن میں بے شمار آنکھیں پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے چٹی سنگھ پورہ کے سِکھ شہیدوں کی آنکھیں، کولگام میں مستقل رہائش پذیر نو کشمیری پنڈتوں کی آنکھیں یا پھر پتھری بل کے معصوم شہیدوں کی آنکھیں جن کو فوجیوں نے اُگروادی بنا کر قتل کر دیا تھا، لیکن جب لوگوں نے فوجی کاروائی کے خلاف زوردار مظاہرے کئے اور ثابت کیا کہ شہید ہونے والے مقامی باشندے تھے جن کو فوجی پکڑ کر لے گئے تھے اور اُنکی لاشیں چھوڑ گئے تھے جب کہ اُن کا دہشت گردی سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا اور وہ سب بے گناہ تھے۔ لوگوں کے اندر بھڑکی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سرکار نے ایک کمیشن بنایا۔ مرنے والوں کی لاشوں کو قبروں سے باہر نکالا گیا اور اُن کا ڈی، این، اے ٹیسٹ کرایا گیا۔ تب جا کر کہیں سرکار کو لوگوں کی سچائی کا یقین ہوا۔ قصوروار فوجیوں کے خلاف کورٹ مارشل اور عدالتی کاروائی شروع کی گئی لیکن سزا کسی کو نہیں ملی بلکہ سبھی بے قصور قرار دیئے گئے۔ جبکہ چٹی سنگھ پورہ اور کُلگام کے شہیدوں سے متعلق تو کوئی کمیشن بھی نہیں بنایا گیا جس کی زوردار مانگ کشمیری پنڈت اور سِکھ بھائیوں نے کئی بار کی تھی۔ ہمارے عدالتی نظام کے طور طریقے دیکھ کر اِن آنکھوں سے ٹپکا لہو پُکار پُکار کر کہہ رہا تھا کہ اُنکو کبھی انصاف نہیں مِل سکتا۔ یہ آنکھیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ ہمارے ملک میں اس طرح کی تاناشاہی کب تک چلے گی۔ سچ کا ترازو کب تک ڈانواں ڈول رہے گا۔ یہ کب برابر تولے گا ــــ پر میں کیا بتاؤں ۔ میں تو چوتھی جماعت سے لے کر آج تک بس یہی دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بھینسے اور بھیڑیئے ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔

جنونی اور فسادی دھرم پرچار، منفی سیاست کے کاروبار اور حد سے زیادہ میڈیا کی دروغ گوئی

نے انسانی رُوح کو مردہ بنا دیا ہے اور ذہن و دِل کو بیمار کر دیا ہے۔ جِسکا علاج اب مذہبی صحیفے اور دھارمک گرنتھ بھی نہیں کر سکتے ۔ عام جنتا یہ باتیں نہیں سمجھتی ۔ یہ سادہ لوح مخلوق لچھے دار اور جھوٹے شبدوں کے جال میں گرفتار ہو چُکی ہے ۔ اِنہیں کون سمجھائے کہ چُوہا سانپ کو کیسے نِنگل سکتا ہے ۔ کیڑیاں پہاڑ کو کیسے اُکھاڑ سکتی ہیں ۔ ہرن بھیڑیئے کا شکار کیسے کر سکتا ہے ۔ میں نے دیکھا کہ سُقراط، منصور اور سرمد ایسے دوستوں کی دُنیا اُجڑ چُکی ہے۔ اُنکی لِکھی تحریروں کا آج کوئی گاہک نہیں۔ للّہ ماں، نُند رِشی، وارث، ہاشم، باہُو، بُلھا سب بھُول بھُلیاں بن چُکے ہین۔ اِس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اِن آنکھوں کو میں تیزاب کے عذاب میں مزید سڑنے نہیں دُوں گا۔ میں نے ایک بڑی قبر کھودی اور کوٹ کی جیبوں سے سبھی آنکھیں نکال کر قبر میں دفنا دیں اور گھر چلا آیا۔ گھر پہونچتے ہی میں نے اپنے ضمیر کے بخئیے اُدھیڑ ڈیئے ۔ دِل اور دماغ میں کیل گاڑھ دیئے اور اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا ___ صبح دم جب میری نیند کھُلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دفن کی ہوئی ساری آنکھیں میرے کمرے کی دیواروں سے مُجھے گھُور رہی ہیں اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔

●

شہرِ خموشاں کا فرشتہ

بابے نُورے کا نام نوراج سندھو تھا۔ اسّی بیاسی سال کے بابا کو سبھی نُورا سندھو بُلاتے تھے
پر اُسکے ہم عمر اُسے نورا کہتے تھے۔ تب میں وقف بورڈ جموں کا چیئر مین اور ضلع کا ڈپٹی
کمشنر تھا جب بابا نُورا میرے دفتر آیا اور ایک ہرے رنگ کی پوٹلی، میری میز پر رکھتے ہوئے
رونے لگا۔ میں اپنی کُرسی سے اُٹھا اور بابے کو چُپ کرانے کی کوشش کرنے لگا لیکن جانے
کب سے اُس کی آنکھوں نے آنسوؤں کا سیلاب روکا ہوا تھا کہ تھمنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔
میں نے چپڑاسی سے پانی لانے کیلئے کہا اور اپنے ہاتھوں سے بابا نُورے کو پانی پلایا۔ اُسکے
لئے چائے منگوائی ۔ اُسے چائے پلائی۔ جب اُسکا من ہلکا ہوا تو وہ کہنے لگا____ "یہ
جو پوٹلی تمہاری میز پر رکھی ہوئی ہے، اِس میں میرے چچا چوہدری لال دین باجوہ کی ہڈیاں
پڑی ہیں۔ چاچا لال دین اور میرے باپ وریام سندھو نے مِتّری کی تھی اور شادی کے وقت
پگڑیاں بدلی تھیں۔ چاچا لال دین ہمارا ہمسایہ تھا۔ ہمارے رشتے بہت پُرانے تھے
۔ میرا دادا اور چاچا لال دین باجوے کا باپ بچپن کے دوست تھے ۔ ہمارا گاؤں
کھوڑ، چھمنب اور اکھنور کے درمیان پڑتا تھا۔ مُلک کی تقسیم سے پہلے چھمنب
اور اکھنور بھمبر تحصیل کی نیابتیں تھیں اور آج اکھنور جموں ضلع کی تحصیل ہے اور چھمنب
بھمبر ضلع کی تحصیل۔ کھوڑ پٹوار تقسیم سے پہلے ہندو، مسلمان اور سِکھ جاٹوں اور زمینداروں
کیلئے مشہور تھا۔ چاچے لال دین کا بیٹا منظور باجوہ اور میں کھوڑ کے پرائمری سکول میں ایک
ساتھ داخل ہوئے تھے۔ ہم دونوں "اتر پتر"، "سنتولیا"، "جھجر پھیسی" اور "بانٹے" کھیلتے
۔ برگد، پیپل، شیشم اور بیریوں کی دھُوپ چھاؤں میں پلتے، اور گرنے ، بیر اور خربوزے

کھاتے جوان ہوئے۔ بھمبر ہائی سکول کے راست اساتذہ سے الفاظ کو سیکھنے اور اُنھیں استعمال کرنے کا ڈھنگ سیکھا۔ ہر اتوار کو ہمارے گاؤں کی چوپال میں یار دوستوں کی محفل سجتی۔ سیف الملوک، ہیر وارث شاہ، قادر یار کا پُورن بھگت اور پیلو کا مرزا صاحباں گانے کے مقابلے ہوتے۔ گاؤں کا نمبردار چوہدری الیاس گھمن جیتنے والوں میں انعام تقسیم کرتا۔ خلوص ومحبت، یاریوں اور دِلداریوں کے سہرے گائے جاتے۔ گاؤں کے نوجوان اکھاڑوں میں زور آزمائی کرتے اور پہلوانی کے داؤ پیچ سیکھتے۔ دُودھ، دہی، لسّی، گھی، شہد، گڑ اور شکر کی مٹھاس میں زندگی ہنستے کھیلتے گذرتی _____ میرے پِتا چوہدری وریام سندھو اور چاچا لال دین باجوہ نے اپنی دوستی مرتے دم تک نبھائی۔ سچ کہوں بیٹا، مجھے پالا ہی چاچا لال دین نے تھا...... اور آج شنکر بھٹے والے نے اُسکی قبر اُکھاڑ دی اور ہڈیاں باہر پھینک دیں اور مٹی گدھوں پر لاد کر اپنے بھٹّے پر لے گیا۔ بیٹا! شنکر بھٹے والے نے کھوڑ کا آدھا قبرستان کھود ڈالا ہے۔ اُسکی جے، سی، بی قبریں توڑنے اور مٹی نکالنے کا کام پچھلے مہینے سے کر رہی ہے۔ جوڑیاں کا سرپنچ اور اکھنور کے وزیر نے مِل کر اینٹوں کا یہ بھٹا لگایا ہے۔ دونوں کی شراکت ہے۔ شنکر سرپنچ کا ہی بیٹا ہے اور بھٹّے کا کام سنبھالتا ہے اور مُردوں کی قبروں کی مِٹی سے اینٹیں بنا کر فروخت کرتا ہے۔ رام، رام، رام، کیا وقت آ گیا ہے۔ جیسے اِنھوں نے مرنا نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ بھٹے والے اپنا رِزق مٹی اور آگ سے کشید کرتے ہیں لیکن قبروں کی مِٹی سے بنی اینٹوں کی کمائی کھاتے اِنہیں شرم نہیں آتی۔ یہ ظلم دیکھ کر میرا ضمیر جاگ اُٹھا۔ میں نے چاچا لال دین کی ہڈیوں کو اکٹھا کیا اور تمہیں دِکھانے کے لئے آ گیا۔ تم میرے ساتھ چلو اور اپنی آنکھوں سے موقع ملاحظہ کرو"۔

بابانُورے کی باتیں سُن کر اور ایک مرے شخص کی ہڈیاں دیکھ کر میرا خُون کھولنے لگا۔ میں نے وقف بورڈ کے فیلڈ افسر کو بُلایا اور بابا نوراج کو ساتھ لیکر تحصیلدار اکھنور کے دفتر پہونچا۔ وہاں سے تحصیلدار، اُسکے عملے اور متعلقہ تھانیدار کے ساتھ کھوڑ کے قبرستان گیا اور بابانُورے کی سچائی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ شنکر حرام زادے نے تو آدھے سے زیادہ قبرستان کھود ڈالا تھا۔ پندرہ، بیس فٹ گہرائی تک کھدائی کی جاچکی تھی۔ قبروں پر پڑی پتھر کی سِلیں اور مُردوں کی ہڈیوں کا ڈھیر ایک کُونے میں پڑا تھا اور جے، سی، بی قبریں توڑنے اور مٹی نکالنے کا کام متواتر کر رہی تھی ۔ میرے کہنے پر ڈرائیور کو گرفتار کر لیا گیا اور جے، سی، بی ضبط کر لی گئی۔ تھانیدار نے چوکی افسر سے کہا کہ وہ شنکر کو بُلانے کیلئے سپاہیوں کو بھیجے۔ آدھے گھنٹے بعد سپاہی بدبخت شنکر کو پکڑ کر لے آئے۔ اُس نے سفید قمیض، سفید پتلون اور سفید بوٹ پہنے تھے ۔ انگلیوں میں سونے اور ہیرے کی انگوٹھیاں اور گلے میں کم سے کم دس تولے کی زنجیر پہنی ہوئی۔ اُس نے آتے ہی تھانیدار سے پوچھا۔

''مُجھے کیوں بُلایا ہے تھانیدار صاحب؟''

تھانیدار نے میری طرف اشارہ کرتے کہا، ''تمہیں ڈی، سی صاحب نے بُلایا ہے''۔

''بتایئے جناب! کیا حکم ہے؟'' اُس نے اکّڑ کر مجھ سے پوچھا

''یہ قبریں تم نے اُکھاڑی ہیں؟'' اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ قبرستان تمہارے باپ کی جاگیر ہے؟''

''جناب، باپ کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ سے بات کریں۔''۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ قبریں تم نے توڑی ہیں؟''

اُس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ چپ چاپ ماتھے پہ شکن ڈالے مجھے گھورتا رہا۔

''خنزیر کے بچے! میں تم سے پوچھ رہا ہوں''

''گالی مت دیں ۔اپنے سرکاری عہدے کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔عدالتیں کھُلی ہیں۔جایئے اور میرے خلاف کیس کریئے''۔

میں نے اُسکے گال پر ایک سناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ دو تین گھونسے اور لاتیں بھی ماریں۔ مجھے دیکھ کر میرے محافظوں نے بھی اُسکی خوب پٹائی کی۔

''حرامی ،مرُدود ! شمشان اور قبرستان کی تعظیم کرنا، اللہ اور ایشور کا شکرانہ ادا کرنا ہوتا ہے ..... اور تم قبروں کی مِٹّی سے اینٹیں بنا کر بیچتے ہو۔ تمہیں موت یاد نہیں۔ تُم انسان ہو یا بھیڑیئے۔ تم نے ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے یا پتھر سے نِکلے ہو۔ بدخصلت، بدمعاش، تم نے اپنے کاروبار کیلیئے قبرستان کھود ڈالا''۔

''جناب! معاف کر دیں۔ غلطی ہوگئی۔ یہ ساری جگہ ویران پڑی ہے۔کوئی وارث نہیں۔ کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا۔اسلیئے.......''۔

''اِس لئے تم نے قبرستان کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کیا زمانہ آ گیا ہے ۔انسانی قدریں ہی مٹ گئی ہیں۔ حالت یہ ہوگئی ہے کہ بھُوتوں کو کیا لگے تابوُتوں کے ساتھ۔۔

_____ بابا! تیرا شکریہ۔تُم نے میری آنکھیں کھول دیں ہیں۔تمہارے جیسے نیک لوگوں کی وجہ سے ہی ابھی انسانیت زندہ ہے ۔بابا، تم نے آج اپنے پُرکھوں کی سنگت کی سجنائی کا صدقہ اُتارا ہے۔تمہاری مہربانی''۔

''بیٹا! میں گھُن لگا درخت ہوں ،داتا کے سہارے کھڑا۔جانے کب ڈھیہ جاؤں ۔میری

طرح اِس قبرستان کے مُردوں کی رُوحیں بھی بین کر رہی ہیں ۔اس لئے اپنا فرض نبھاؤ ۔شنکر جیسے نامُرادوں کو سبق سکھاؤ۔"

میں نے تھانیدار کو تحریری حکم دیا کہ وہ شنکر کے خلاف کیس درج کرے۔ اُسے گرفتار کر کے چالان عدالت میں پیش کرے۔ وقف بورڈ کے فیلڈ افسر کو ہدایت کی کہ وہ قبرستان کی پُختہ چاردیواری کرائے اور چوکیداری کے لئے ملازم رکھے۔

دوسرے دِن صبح مجھے ایک منتری صاحب کا فون آیا۔ وہ بڑے غصے میں تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم ڈی ،سی بول رہے ہو؟"

"ہاں میں بول رہا ہوں۔ کہیئے ...."

"تم کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ تم ایک شریف اور عزّت دار شہری سے مار کُٹائی کرواور اُسے حوالات میں بند کرادو"۔

"تم کون بول رہے ہو؟"۔

"میں مال منتری اروند شرما بول رہا ہوں۔"

"منتری جی ! آپکو ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات معلوم ہونے چاہئیں ۔اگر ڈی سی چاہے تو قانون توڑنے والے کسی بھی شخص کو اپنے ضلع کی حُدود سے باہر نکال سکتا ہے، پھر وہ چاہے کوئی وزیر ہی کیوں نہ ہو"۔

"اپنی بکواس بند کرو۔ مجھے قانون سمجھانے کی ضرورت نہیں ۔ میں سب جانتا ہوں ۔بس تم شنکر کی رہائی کا حکم دو ورنہ کل تک تُم کو تمہاری اوقات بتادُوں گا"۔

"بکواس تم کر رہے ہو۔ تمہارا شریف اور عزّت دار شہری قبر چور ہے۔ قبروں کی بے حُرمتی کرنے والا۔ قبرستانوں کی کھُدائی کر کے مُردوں کی مٹی سے اینٹیں بنانے والا مُجرم۔ اُسکا چالان عدالت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تم عدالت کا دروازہ کھٹکاؤ..... اور اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تم نے سُنا نہیں کہ تُرش آدمی کا شہد بھی کڑوا ہوتا ہے۔ باقی میں تمہاری ساری کرتُوتیں جانتا ہوں۔ میری بات یاد رکھنا کہ ضعیف اور بوڑھے شیر کے یار، کُتے، گیدڑ اور بھیڑیئے ہوتے ہیں۔ اسلئے پھُنکارنا بند کرو۔ میرے لئے شریف، عزت دار اور آدر یوگ تو بابا نوراج ہے جس نے قانون کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے ضمیر اور انسانیت کا پرچم بُلند رکھا۔ اِس لیے دھمکیاں کسی اور کو دینا"۔

میری باتیں سُن کر منتری نے فون بند کر دیا ___ دوپہر کے وقت جب میں اپنے دفتر میں مصروف تھا تو چیف سیکریٹری صاحب کا بُلاوا آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ منتری کے کرودھ کی ہانڈی اُبل رہی ہوگی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ہانڈی کا چھلاّ اور توّے کا تھلاّ ہمیشہ کالا ہی رہتا ہے۔ جب میں چیف سیکریٹری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے غُصے میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم نے منتری جی کو گالیاں دی ہیں اور اُن کے ایک ورکر کو حوالات میں بند کرا دیا ہے"۔

"سر! گالیاں میں نے نہیں بلکہ منتری نے مجھے دی ہیں۔ انتہائی گھٹیا زبان استعمال کرتے ہوئے مجھے میری اوقات بتانے اور کھُڈے لائن لگانے کی دھمکیاں دی ہیں۔ میں نے بھی تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اُسے جواب دیئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شیشم کے پیڑ اور مجھے کانٹے دار جھاڑی سے تعبیر کر رہا تھا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ تم جیسے سیاست دان کچی

مٹی کا گھڑا ہوتے ہیں جو طوفانی لہروں کی مار نہیں سہہ سکتے جبکہ ہم دھات کے بنے برتن ہوتے ہیں جو ٹوٹتے نہیں''۔

پھر میں نے چیف سیکریٹری صاحب کو ساری رُوداد تفصیل سے سُنائی اور اُنھیں تحریری رپورٹ بھی پیش کی۔ اینٹوں کے بھٹے میں منتری کی شراکت کے ثبوت بھی دیئے۔ چیف سیکریٹری صاحب نے میرا بازو پکڑا اور مجھے وزیرِاعلیٰ کے کمرے میں لے گئے۔ اُنہوں نے وزیرِاعلیٰ کو اُنکے وزیر کی کرتوتوں اور غیر قانونی حرکتوں سے آگاہ کیا۔ اُسکے خلاف آئی کئی اور شکایتوں کے بارے میں بھی بتایا۔ وزیرِاعلیٰ غُصے سے لال پیلے ہونے لگے اور اپنے منتری کو لعنتیں بھیجنے لگے۔ پھر کہنے لگے۔

''اس نیچ اور گھٹیا شخص کو میں اپنی کیبنٹ میں بالکل برداشت نہیں کرسکتا۔ میں کل ہی کیبنٹ میٹنگ بُلا رہا ہوں۔ سب کے سامنے اسے ذلیل کروں گا اور پھر اِسکا استعفیٰ طلب کروں گا۔''

چیف سیکریٹری صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور مجھے پوری لگن اور بے خوفی سے اپنی ڈیوٹی کرنے کی ہدایت دی۔

پھر کچھ دِنوں بعد مجھے واقعی کھُڈے لائن لگا دیا گیا اور میری ٹرانسفر دُور دراز ایک فضول سی کارپوریشن میں کردی گئی اور یہ ثابت کردیا کہ آج کی دوغلی راج نیتی میں راج دھرم کا کال پڑا ہوا ہے اور سیاست کے تیلی سچ کے بیلی نہیں ہوتے کیونکہ منتری صاحب آج بھی وزیرِاعلیٰ کی کیبنٹ کے ہردلعزیز وزیر ہیں اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔

کالے بادلوں میں چھُپا سُورج

یہ وادی پوری طرح پہاڑوں سے گھِری ہوئی ہے۔چاروں اطراف پہاڑ،کیلوں کی طرح دھرتی کے اندر گڑھے ہوئے ہیں۔گھاٹی سے باہر رہنے والی یاجُوج اور ماجُوج کی قوم پہاڑوں میں دراڑیں ڈال رہی ہے سُرنگیں کھودکھود کر پہاڑوں کو چھلنی کررہی ہے۔یاجُوج اور ماجُوج کے وارثوں کا دعویٰ ہے کہ گھاٹی اُنکی ملکیت ہے لیکن گھاٹی کی خلقت کو یہ بات منظور نہیں ۔وہ تو اپنی مرضی کے مطابق جینا چاہتی ہے مگر یہ فیصلہ یاجُوج اور ماجُوج کی قوم کو قبول نہیں۔عوامی خواہش کو دبانے اور آوازوں کے شور کو خاموش کرانے کیلئے گولیاں چلانے اور بارُود سے غُسل کرانے کا رواج عام ہے۔جس کے نتیجے میں لاشوں کو ٹھکانے لگانے اور گِدھوں کو ماس کھِلانے کیلئے اُنکے حواری دِن رات کام کرتے رہتے ہیں اور اپنے پر جاتنتر ہونے کے گُن گاتے رہتے ہیں۔

پہاڑ کاٹنے اور میلوں لمبی سُرنگیں بنانے کی وجہ سے دھرتی بنجر قدیم بن گئی ہے۔پھر بھی یہ لوگ وادی پر اپنا حق جتانے سے باز نہیں آتے اور خلقِ خُدا کو محکوم بنانے کیلئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرتے رہتے ہیں۔گلوبلی سرپنچ دُور بیٹھکر تماشہ دیکھتا رہتا ہے۔کبھی کبھی وہ دونوں کو گھُورتا بھی ہے اور کان مروڑنے کی دھمکی بھی دیتا ہے لیکن یہ دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے کیونکہ اِنکے تو کان ہی نہیں ہیں پھر کیسے کان مروڑے جاسکتے ہیں۔اِنکی دادا گری اور دارُوگری پر کوئی روک نہیں لگا سکا ہے ۔وادی کی آبادی بارُود سے ہورہی تباہی سے بیزار ہے۔قبریں کھود کھود کر اور لاشیں دفنا دفنا کر تھک چکی ہے۔ذِلّت اور رُسوائی سہہ سہہ کر اُکتا چکی ہے لیکن...... طاقت اور دہشت

کے آگے بے بس ہے۔ ہمیشہ ڈر اور خوف میں جی رہی ہے۔

____ لیکن اب ..... اِس گھاٹی میں نئی نسل لڑکپن اور بلُوغت کی حدوں کو چھو رہی ہے ۔ یہ نسل جس نے اپنے خُون اور دودھ کے رِشتوں کو مرتے دیکھا ہے ۔صنفِ نازک کی عِصمتیں لُٹتے دیکھا ہے۔ ذِلّت ،نفرت ،دہشت ،طاقت اور بربریت کا ننگا ناچ دیکھا ہے ،اب ..... وِرودھ کرتے ڈرتی نہیں ۔اِس نسل نے اب ڈر، وحشت، دُکھ اور درد کے ماحول میں جینا سیکھ لیا ہے۔ یہ نسل آج اپنا حق مانگنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے مرنا ضروری سمجھتی ہے۔حق وصداقت کیلئے ہر قسم کی قُربانی دینے کیلئے تیار ہو چکی ہے۔ یہ نسل کہتی ہے۔

"آؤ اور ہماری چھاتیوں کو گولیوں سے چھلنی کردو۔ ہمیں اندھا بنا دو۔ ہمارے سر کُچل دو ۔لاشوں کے انبار لگا دو۔ پھر بھی ہم تھکیں گے نہیں۔ بے شک ہماری شہ رگ کاٹ دو ۔ ہمارے اٹُوٹ انگ توڑ دو ۔ ہمارے لہُو سے جتنی چاہو ، ہولی کھیلو مگر ہم مریں گے نہیں ۔ہم زندہ رہیں گے۔ ہماری رگوں میں خُون دوڑتا رہے گا"

ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ماں کی اُنگلی پکڑ کر چلنے والے بچے، سکولی کتابوں سے بھرے بھاری بستے اُٹھا کر چلنے والے معصوم طالب علم ،تعلیم یافتہ اور کاروباری نوجوان غرض پوری نئی نسل ریاستی دہشت گردی کے خلاف سڑکوں پر نِکل آئی ہے۔ بچے پتھروں کے بدلے گولیاں کھاتے ہیں لیکن بھاگتے نہیں۔ بے رحم طاقت کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ یاجُوج اور ماجُوج کی قوم کے خلاف نعرے بازی کرنے لگتے ہیں۔ بے گُناہ لاشوں کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں کی گنتی میں شہیدوں کے جنازوں میں شرکت کرتے ہیں۔شہیدی نغمے ،لوک گیتوں کا چولا پہن لیتے ہیں اور پھر یہ گیت پوری گھاٹی میں گونجنے لگتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے برسوں پُرانی مکّر فریب کی راج نیتی کنگال ہوگئی ہے۔راج دربار کے کھوٹے سِکے شاید چلنے بند ہوگئے ہیں ۔کیوں کہ پوری گھاٹی جوالا مُکھی بن گئی ہے۔جس میں سے آگ کے شُعلے نِکل رہے ہیں۔جوالا مُکھی نے کھیت کھلیانوں اور جنگل بیلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ہر طرف راکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور اِس راکھ سے اُگی نئی نسل نے خود کو مرنے اور مارنے کیلئے تیار کرلیا ہے۔

بستیوں میں کالے بادلوں کی وجہ سے گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل رہا ہے۔گھروں میں دُھول اور مٹی کی فصل نے ڈیرے ڈالے ہیں۔گرد وغبار کی آندھی چل رہی ہے۔یہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی ۔سبھی گھر مِٹی رنگے ہوگئے ہیں ۔جِتنی صفائی سُتھرائی کرلیں ،گرد آلود آندھی گھروں سے نِکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔جوالا مُکھی گھاٹی کا سینہ جلا رہی ہے۔

بچوں کے لجپال اُنکی دیکھ بھال اور سنبھال کرتے ہیں۔اُنکو سمجھاتے ہیں لیکن یہ طوفان، یہ آندھی اُن سے سنبھالی نہیں جارہی۔وادی کی نئی نسل اپنے جسموں پر لگے زخموں کو زندہ رکھنا چاہتی ہے، کیونکہ اُن کے دِلوں پر پڑے چھالوں نے اُنکی رُوح کو جھلسا دیا ہے۔

بچوں نے اپنے خواب دریا بُرد کردیئے ہیں اور جنم سے ہی مرنے کا سبق رٹ لیا ہے۔اِن کے دُکھ، درد، بے بسی، بے چینی اور کرودھ کو جُنون میں بدلنے کیلئے ٹیلی ویژن چینلوں کی چاٹیوں میں آئے دِن وادی کے بارے میں کھٹی لسّی چھولنے والے ہر فن مولا کلاکاروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو جھوٹ کی تلوار سے سچ کا گلا کاٹتے ہیں اور اپنی دیش بھگتی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔اخباروں کی شہ سُرخیوں اور ٹیلی ویژن چینلوں کے انکشافات سے نوجوانوں کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے۔جھوٹی کہانیاں اور بے ایمانیاں نئی نسل کو کٹّر وادی

بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں ۔اوپر سے نام نہاد دھارمک گوروا ور مذہبی رہنما جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں ۔

یاجُوج اور ماجُوج کی قوم کے جانشین اِن حالات کیلئے ایک دوسرے کو دوشی ٹھہراتے ہیں اور زہر یلے لفظوں کے تیر چلاتے رہتے ہیں لیکن عوامی غُصے کو ٹھنڈا کرنے اور مسئلے کا حل نکالنے کیلئے کوئی قدم نہیں اُٹھاتے ۔ بلکہ ترشُولی گیت اور چاند تارے کے ترانے بجانے لگ جاتے ہیں ۔شہ رگ اور اٹوٹ انگ کے پھیکے رنگوں کو بندے ماترم اور نعرۂ تکبیر سے گہرا کرنے کی کوشش میں جُٹ جاتے ہیں ۔ایک دوسرے کو آنکھیں دِکھانے لگتے ہیں ۔ یہ دونوں پہلے بھی کئی بار مار کُٹائی کر چکے ہیں ۔آدم کی نسل اُجاڑ چکے ہیں ۔ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے ۔مِل بیٹھ کر مسئلے کا حتمی حل ڈھونڈنے کی بجائے قابض رہنے کے ہتھکنڈے آزماتے رہتے ہیں ۔لوگوں کی آرزوؤں کو کُچلنے کیلئے نئے نئے منصوبے بناتے رہتے ہیں ۔

یہ مٹی کے کھلونے طاقت ، لنّا اور اہنکار کے نشے میں ڈوبے ہیں ۔دونوں نے عقل اور سُوجھ کو تالوں میں بند کر رکھا ہے ــــــ کاش !اِنہیں کوئی نُند رِشی کا کتھن یاد دِلائے جو کہا کرتے تھے کہ دونوں...... دُودھ اور شکر ہیں اور دُودھ میں شکر ملانے سے مِٹھاس بڑھتی ہے اور پینے سے محبت کی خُوشبو پھیلتی ہے ۔اگر اِنہوں نے اِس کتھن پر عمل نہیں کیا تو دُودھ پھٹ جائے گا اور سب کُچھ مِٹ جائے گا ــــــ پھر کوئی تیسری قوم گھاٹی کو غُلام بنائے گی اور یہ دونوں ایک دوسرے کا مونہہ دیکھتے رِہ جائیں گے ۔

●

کھیلن کو مانگے چاند

آزادی کی تحریک یہاں پچھلی ایک صدی سے چل رہی ہے۔ اِس تحریک میں ہزاروں آدمی مرے ہیں اور ہزاروں قیدی بنائے گئے ہیں۔ گُم نام قبروں کا کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ تین صدیوں سے یہاں بندوق کا راج چل رہا ہے۔ لہو رنگی سڑکوں پر فوجی بُوٹ مارچ کرتے رہتے ہیں اور اپنی طاقت کی دھمک سے لوگوں کو دھمکاتے رہتے ہیں پر نہ آزادی کے لئے جدوجہد ختم ہوئی ہے اور نہ جلسے، جلوس اور ہڑتالیں ختم ہوئی ہیں۔ خرید و فروخت کی منڈیوں میں سیاسی اور مذہبی دلالوں پر اربوں ڈالر خرچ ہونے کے باوجود نہ تو آزادی کے حق میں نعرے لگنے بند ہوئے ہیں اور نہ جلسے جلوس اور ہڑتالیں ______ ''یہ مُلک ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے،'' جیسے نعرے لگاتے لگاتے کئی نسلیں ختم ہو گئیں اور کئی نسلیں پیدا ہوئیں۔

یہ نعرے آج بھی لگ رہے ہیں ...... گلی محلوں میں ...... کھیت کھلیانوں میں، پہاڑ، میدانوں میں۔ اب تو معصوم کمسن بچے بھی ٹولیاں بنا کر آزادی کا کھیل کھیلتے ہیں ______ اپنی اپنی گلیوں میں، محلوں میں اور سڑکوں پر آ کر جلوس نکالتے ہیں اور نعرے مارتے ہیں۔

''آزادی ہمارا پیدائشی حق، چھین کے لیں گے اپنا حق'' فوجی جوان بچوں کو سمجھاتے ہیں.... ڈراتے ہیں لیکن سرکش بچے کسی کی نہیں سُنتے۔ وہ اپنا کھیل بند کرنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ فوجی طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ آنسو گیس اور گولیاں چلاتے ہیں۔ بچے جوابی حملہ پتھروں سے کرتے ہیں لیکن پتھر گولیوں کا مقابلہ بھلا کیسے کر سکتے ہیں۔ نتیجے میں کُچھ بچے مارے جاتے اور کچھ زخمی ہوتے ہیں کیونکہ بچوں کو آزادی اور بربادی کی کوئی سمجھ نہیں ہوتی۔

_____ لیکن آج ایک عجیب واقعہ ہوا۔بچوں کے جلوس کو تتر بتر کرنے کے لئے فوج نے ہلّہ بولا۔ دو بچے مارے گئے ۔کُچھ زخمی ہوئے۔فوجی کاروائی کی وجہ سے دُکاندار اپنی دُکانیں کھُلی چھوڑ کر بھاگ گئے ۔سڑکیں ایک دم ویران ہوگئیں۔ایک جیپ میں بیٹھے نوجوان فوجی افسر نے دیکھا کہ دواڑھائی سال کا ایک بچہ لاش کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔بچے کو روتے دیکھ کر فوجی افسر کو ترس آ گیا۔وہ جیپ سے اُترا اور اُس بچے کے پاس گیا۔اُس نے بچے کو گود میں اُٹھایا۔آریہ نسل کا بچہ انتہائی خوبصورت تھا۔افسر نے اُسے چُپ کرایا۔اُسے پیار سے سہلایا اور ایک دُکان سے چاکلیٹ اور ٹافیاں لے کر دیں۔چاکلیٹ اور ٹافیاں لینے کے بعد بچہ چُپ ہوگیا اور فوجی افسر کو دیکھ کر مُسکانے لگا۔افسر اُسے لیکر اپنی جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔اُس نے بچے کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ اور چاہیئے بیٹا؟''

بچے نے ہاں میں گردن ہلائی

فوجی افسر نے پوچھا،''اور کیا چاہیئے ہمارے بیٹے کو؟''

بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

''اجادیؔ''

اور فوجی افسر بچے کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔

●

(نوٹ) غلام نبی شاہد کی کہانی کا آخری جملہ اپنے دوست خالد بشیر احمد سے سُن کر یہ افسانہ لکھنے کی تحریک ملی۔

جُوتی قصوری

نمرتا اور میں آرمی سکول نینی تال میں اکٹھے پڑھے۔ بعدازاں اُس نے دہلی یونیورسٹی سے اور میں نے کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم،اے کی ڈگری حاصل کی۔ اِس بیچ ٹیلی فون پر ہمارا رابطہ لگاتار رہتا۔ پھر ہم دونوں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں کوچنگ لینے کے لئے دوبارہ دہلی میں اکٹھا ہوئے۔ ہم دونوں نے پہلے ہی ہلے میں آئی،اے ،ایس کا امتحان پاس کرلیا۔ مجھے جموں کشمیر کیڈر ملا اور نمرتا کو مہاراشٹر کیڈر۔ نمرتا کی شادی ممبئی کے ایک بڑے صنعتی گھرانے میں ہوئی اور اپنے سُسر کے کہنے پر اُس نے ایڈمنسٹریٹو سروس سے استعفیٰ دے کر اپنی ٹیلی کام کمپنی کا چیف ایگزیکٹیو بننا قبول کرلیا اور بڑے سلیقے سے کاروبار کو وسعت دی۔ اب ہماری بات چیت کبھی کبھار ہوتی اور وہ بھی ہیلو، ہائے تک۔

_____ تب میں جموں صوبہ کا ڈویژنل کمشنر تھا جب ایک دِن مجھے نمرتا کا فون آیا ۔''اقبال! میں جموں آرہی ہوں۔ اپنے دونوں بچوں اور سہیلی کے ساتھ۔ میں تمہارے پاس ٹھہروں گی۔ میرے ساتھ کمپنی کی ایک سروے ٹیم بھی آرہی ہے۔ تُم اُنکے ٹھہرنے کا انتظام کسی بڑھیا سے ہوٹل میں کرادینا۔ سارا خرچہ کمپنی برداشت کرے گی۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ اِس لئے فِکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جموں میں ٹیلی کام یونٹ لگانا چاہتے ہیں۔''

تین چار دِنوں بعد نمرتا اپنی ٹیم لے کر جموں پہونچ گئی۔ میں نے اُن کے لئے ایشیا ہوٹل میں انتظام کیا تھا..... اور نمرتا اپنے بچوں اور جرنلسٹ سہیلی کے ساتھ میری سرکاری کوٹھی میں رُکی۔ اُسکا میرے پاس ٹھہرنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ہم بڑی دلچسپی سے زندگی کی کتاب کے

ورقے پلٹتے رہے۔ بچپن، کم سنی اور جوانی کے قصے یاد کرتے رہے اور آج کی ذمہ داریوں کا رونا بھی روتے رہے۔ سروے ٹیم نے اپنا کام ختم کرلیا تھا اور رپورٹ نمرتا کو پیش کردی تھی۔ ٹیم نے میراں صاحب میں بنجر قدیم زمین کا ایک تیس ایکڑ ٹکڑا پسند کیا تھا۔ میں نے، ڈپٹی کمشنر جموں اور متعلقہ تحصیلدار کو ہدایت کی کہ وہ جلد سے جلد کاغذات بنائے تا کہ زمین کی رجسٹری کرائی جاسکے۔

______ ایک دِن شام کو کوٹھی کی چھت پر بیٹھے ہم سیالکوٹ شہر کی جگمگاتی بتیاں دیکھ رہے تھے کہ نمرتا اور اُسکی پتر کار سہیلی نے بارڈر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے رنبیر سنگھ پورہ کے تحصیلدار کو فون کیا اور ہند، پاک سرحد دیکھنے کیلئے بندوبست کرنے کیلئے کہا______

دوسرے دِن ہم سب سُچیت گڈھ بارڈر پہنچے۔ سرحدی حفاظتی پولیس کے افسروں نے ظہرانے کا انتظام کیا تھا۔ تحصیلدار، اُسکا عملہ اور بی، ایس، ایف کے اہلکار خدمت کے لئے حاضر تھے۔ ہم سب نے اُسی ہال میں لنچ کیا جہاں 1973ء میں بھارت اور پاکستان کے ملٹری کمانڈروں نے جنگ بندی لائن کو حقیقی کنٹرول لائن میں بدلا تھا اور اس سے متعلق نقشوں کا تبادلہ کیا تھا۔

ظہرانے کے بعد، نمرتا، اُس کے بچوں اور صحافی سہیلی کو لیکر میں اپنی طرف کے گیٹ کے پار گیا اور پھر ہم نو مین لینڈ کے درمیان بنے رُکاوٹی جنگلے کے پاس پہونچے۔ نو مین لینڈ کے دوسری جانب پاکستان کی سرزمین تھی۔ پول کے ساتھ ہی کنکریٹ سے بنی سرحدی بُتی لگی ہوئی تھی جسکو پیپل کے درخت نے اپنی جڑوں میں جکڑا ہوا تھا۔ آج پیپل کا یہ درخت آدھا ہندوستان اور آدھا پاکستان بن چُکا ہے۔ اِسے ہم سیاست کی ستم ظریفی نہیں کہیں گے

تو اور کیا کہیں گے۔

رُکاوٹی پول کے دوسری طرف پاکستانی پنجاب سے بھی بڑی تعداد میں لوگ سچیت گڑھ ،سیالکوٹ سرحد دیکھنے آئے تھے ۔پاکستانی بچے اور جوان ہندوستانی لوگوں سے ہاتھ ملا کر خوش ہو رہے تھے۔ایسا ہی ماحول ہماری طرف بھی تھا پھر میں نے دیکھا کہ اِیک دِلرُبا مُٹیار اپنی مستی میں بدن کی گیلی مٹی کی مہک لُٹاتی ہوئی نمرتا کے پاس آئی۔اُس نے پہلے آداب کہا اور پھر نمرتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر حال احوال پوچھنے لگی۔اُس ملاپڑی دوشیزہ کے ساتھ نمرتا نے بھی کھُل کر باتیں کیں۔دونوں خلوص ومحبت سے پیش آرہی تھیں۔اچانک نمرتا کی نظر اُس دوشیزہ کے پاؤں میں پڑی اصلی تِلے دار جُوتی کی طرف گئی۔نمرتا نے جُوتی کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ خوبصورت جوتی کہاں کی بنی ہے۔

''باجی ! یہ قصور کی جُوتی ہے ۔آپ نے ہماری گائیکہ سُریندر کور کا یہ گیت نہیں سُنا ہو یا۔ . . ''جُتی قصوری ، پیریں نہ پُوری، ہائے ربّا وے ساہنوں ٹُرنا پیا'' ــــــ

قصور کی جُوتیاں، کھُسے اور میتھی پوری دُنیا میں مشہور ہیں۔اُس حسین لڑکی نے اپنے ایک پاؤں سے جُوتی نکالی اور نمرتا کی طرف بڑھائی اور کہنے لگی ــــــ ''آپ اِسے پاؤں میں پہن کر دیکھیں۔میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ بھلا آپکے پاؤں میں کیسے لگے لگی۔''

نمرتا نے جُوتی اپنے پاؤں میں ڈالی جو اُسے پوری آ گئی تھی۔اُس پُرکشش لڑکی نے دوسرے پاؤں سے بھی جُوتی اُتاری اور نمرتا کو دی ۔نمرتا نے دونوں پیروں میں قصوری جُوتی ڈال کر تھوڑا سا چل کر دیکھا۔

''باجی! یہ جُوتی آپ کے پیروں میں خُوب سج رہی ہے۔'' اُس نے پیار سے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے آئی ہو؟'' نمرتا نے پوچھا۔

''باجی! میرا نام عالیہ کھوکھر ہے اور میں ڈسکے سے بارڈر دیکھنے آئی ہوں ۔ڈسکہ سیالکوٹ کے قریب ہی ایک بڑا قصبہ ہے اور آپ کہاں سے آئی ہیں؟''۔

''میں ممبئی سے آئی ہوں۔ ہم بھی سُچیت گڈھ بارڈر دیکھنے آئے ہیں''۔نمرتا نے جواب دیا۔

آپ سے مِل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا دِل باغ باغ ہو گیا ہے۔اب میری ایک گذارش ہے ۔میری چھوٹی سی آرزو۔ میری تمنا پوری کر دیں۔ دیکھیں،انکار نہیں کرنا''۔

''ہاں ہاں! بتاؤ تمہاری کیا خواہش ہے؟''۔

''باجی! میری التجا ہے کہ اب یہ جُوتی آپ نے پیروں سے اُتارنی نہیں ہے۔ اِسے چھوٹی بہن کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیں''۔

''تمہارا دِل موتیوں کی مالا ہے لیکن میں تمہارا تحفہ قبول نہیں کر سکتی کیونکہ یہاں سے تم ننگے پاؤں کیسے جاؤ گی۔''

''باجی! آپ فکر نہ کریں۔ گیٹ کے باہر میری کار کھڑی ہے۔اُس میں قصُوری جوتیوں کا دوسرا جوڑا پڑا ہے۔ میں گیٹ تک آرام سے چلی جاؤں گی۔آپ انکار نہ کریں اور مجھے عزّت بخشیں اور شفقت دِکھائیں۔''

میں خاموشی سے یہ دِل لُبھانے والا نظارا دیکھ رہا تھا۔نمرتا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے مان جانے کیلئے کہا۔نمرتا نے عالیہ کو گلے لگایا اور دُعائیں دیتے ہوئے کہا۔

''ایشور کرے کہ اس دھرتی کے پانچ دریا پیار کی سُر میں ہمیشہ بہتے رہیں ۔ان میں کبھی طغیانی نہ آئے۔''

''اللہ سائیں آپ کی دُعا قبول فرمائے اور اپنی رحمتِ باراں سے ہمیں ہریالی اور خوش حالی بخشے''۔

نمرتا بڑی خوش تھی۔ وہ بہت جذباتی ہوگئی تھی۔ کار میں بیٹھے وہ دونوں ملکوں کے درمیان امن اور شانتی کیلئے دُعائیں مانگ رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔

''اقبال! ممبئی پہونچ کر میں دِل کو چھُونے والی یہ کہانی اپنے ایک فلمی پرڈیوسر دوست کو سُناؤں گی اور اُسے اِس موضوع پر فِلم بنانے کے لئے کہوں گی تا کہ نفرت کی دیواریں گِرانے میں ہم بھی اپنا کُچھ حِصہ ڈال سکیں''۔

نمرتا کی پترکار سہیلی بھی بولی۔

''میں بھی اِس خوبصورت واقع کے بارے میں اخبار میں ایک کہانی لِکھوں گی پر میری کہانی ایک نئے موڑ پر ختم ہوگی''۔

''نیا موڑ.... ؟ وہ کون سا..... ؟'' نمرتا نے پوچھا۔

''میری کہانی میں پٹیالے کی زنانہ جُوتی کا تحفہ نمرتا عالیہ کو دے گی''۔

''دُر پھٹے مونہہ تیرا۔ یہاں بھی تم ڈنڈی مارو گی''۔

نمرتا نے اپنی سہیلی کی چُٹکی لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں ہنسنے لگیں۔

لیکن میرا دِل کہہ رہا تھا کہ بات قصور یا پٹیالے کی نہیں ہے بلکہ بات تو قصور اور پٹیالے کے رِشتے کی ہے۔

لالہ غنی

لت کسی بھی چیز کی ہو، بہت بُری ہوتی ہے۔ چاہے شراب کی لت ہو، چرس، گانجے یا افیم کی لت ہو۔ جھوٹ، مکّر، فریب کی لت ہو یا پھر لوگوں کی ٹانگیں کھینچنے اور اُٹھانے کی لت ہو۔ خاصکر صنفِ نازک کو بہلانے اور پھُسلانے کی لت۔ اِس لت میں اپنی لاتیں ٹُوٹنے کا پکا یقین ہوتا ہے۔ عدالتوں کی پیشیاں بھُگتنے اور سزائیں الگ۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہی کہتا ہے، کیونکہ میں نے خود اس طرح کے حادثے دیکھے ہیں۔ کرکٹ کی دُنیا کے ایک عمدہ کھلاڑی کو ایک مشہور فلم ایکٹرس اور گلوکارہ سے عِشق لڑانے کی لت تھی۔ ایک دِن اچانک اُس فلمی اداکارہ کا خاوند جب گھر آیا تو اُس وقت کرکٹ کھلاڑی بیٹنگ کر رہا تھا۔ جب نوکرانی نے صاحب کے آنے کی خبر سُنائی تو کرکٹ کھِلاڑی نے فلیٹ کی تیسری منزل سے چھلانگ لگادی۔ نتیجہ یہ نِکلا کہ وہ اپنی لات تڑوا کر ہمیشہ کے لئے گُم نامی کے کنویں میں جا ڈُوبا۔

اِسی طرح جُوئے کی لت بھی بڑی تباہ کُن ہوتی ہے۔ یہ لت میرے یار لالہ غنی کو بھی لگی ہوئی تھی۔ لالہ غنی نے ساری عمر جُوا کھیلا۔ اُسے جنُون کی حد تک جُوئے بازی کی لت تھی لیکن وہ ایک اناڑی کھلاڑی تھا۔ وہ کبھی جُوئے میں نہیں جیتا۔ ہمیشہ ہارتا رہا۔ جیتنے کی آس میں اُس نے اپنی ابھاگن بیوی کا سارا زیور، جدّی مکان اور نہ جانے کیا کیا ہارا تھا۔ اُسے روز بیوی سمجھاتی کہ جُوا اور جواری صرف خجل خواری ہے لیکن اُس نے کسی کی بھی نہیں سُنی۔ جُوئے کی لت مرتے دم تک اُسکے ساتھ جُڑی رہی۔

لالہ غنی مُنصف عدالت میں چپڑاسی تھا۔ تنخواہ لیکر وہ کبھی سیدھے گھر نہیں گیا بلکہ جُوے کے اڈہ پر سارے پیسے ہار کر ہی گھر جاتا۔ عدالت میں ہونے والی اوپر کی کمائی بھی جواریوں کے نصیب

میں لِکھی ہوتی۔ لالہ غنی کی اِس لت کی وجہ سے نہ جانے کِتنے جواریوں کے گھر چلتے تھے۔ جبکہ اُسکی بیوی لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچا کر کے، کپڑے اور برتن صاف کر کے اپنے بچوں کو پالتی۔ قرابت دار اور یار بیلی لاکھ سمجھاتے۔ اُسے لعنت ملامت کرتے لیکن لالہ غنی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُسکے کان بند تھے اور آنکھیں اندھی ہوگئی تھیں ــــــ اُس نے کبھی شراب نہیں پی۔ چرس، گانجے اور افیم کا نشہ نہیں کیا۔ صرف چار مینار کے سیگرٹوں کا شوقین تھا اور جُوئے کا جنُونی۔ شاید اُسکے اندر پانڈووں کی رُوح کا بسیرا تھا جنہوں نے دروپتی تک کو اِس جُوئے کی لت کی وجہ سے ہار دیا تھا۔ لالہ غنی سب کچھ ہارنے کے باوجود اپنے آپکو کبھی گُناہگار نہیں سمجھتا تھا۔ اُسکی بیوی نے بچوں کو پالنے پوسنے اور اُنکی زندگی بنانے کیلیۓ اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ اِسی جدوجہد میں آخر وہ اپنی زندگی کا جُوا ہار گئی۔ عدالتی حاکموں نے ترس کھا کر لالہ غنی کے بڑے بیٹے کو عدالت میں کلرک بھرتی کر لیا۔ ماں کی فوتگی کے بعد اب وہ بہن بھائیوں کو پالنے لگا۔ لالہ غنی نے تو کبھی گھر گھرہستی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا مگر ماں کے خوابوں کو پُورا کرنے کیلیۓ اُسکا کلرک بیٹا لگن سے کام کر رہا تھا تا کہ اُس کے بہن بھائی پڑھ لِکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

ــــــ پھر ایک دِن لالہ غنی نوکری سے فارغ ہوگیا۔ چالیس برس کی عدالتی خدمت کرنے کے بعد وہ سبکدُوش ہوا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی اُسکی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑا ــــــ اب وہ اپنی پنشن کی رقم کے ساتھ جُوا کھیلتا اور جواریوں کے آگے اپنی جیب خالی کر کے گھر جاتا۔

بیٹا باپ کو سمجھاتا۔

''لالہ! جُوا کسی نے نہیں جیتا۔ سب جُوئے نے جیتے ہیں''۔

پر لالہ غنی کو جیتنے اور ہارنے سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اُسے تو جُوئے کا نشہ تھا جو کبھی نہیں اُترا۔

ایک بار لالہ غنی پنشن لے کر جوئے کے اڈے پر گیا تو وہاں پولیس کا چھاپہ پڑ گیا تھا اور کُچھ جواری پکڑے گئے تھے جبکہ باقی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ لالہ غنی مایوس ہو کر توی ندی کی اور چل پڑا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک مچھیرا مچھلیاں پکڑنے کیلئے دریا میں جال پھینک رہا ہے۔ وہ اُس کے پاس گیا۔ مچھیرا مچھلیاں پکڑ پکڑ کر بوری میں ڈال رہا تھا۔ اُس نے لالہ غنی کو پہچان لیا تھا کیونکہ وہ اکثر مچھلی بیچنے اُسکے محلّہ تالاب کھٹیکاں جایا کرتا تھا۔ علیک سلیک کے بعد لالہ غنی نے مچھیرے سے پوچھا۔

''تاش کھیلو گے''؟

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔ مچھیرے نے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ میرے پیسے اور تمہاری مچھلیاں'' لالہ غنی نے کہا۔

''کیا مطلب......؟......وہ کیسے؟''۔

''دوسو روپیے کلو کے حساب سے تمہاری مچھلیوں کا جتنا وزن ہوگا، اُتنے میرے پیسے''۔ لالہ غنی نے مچھیرے کو سمجھایا۔

یوں دونوں جُوا کھیلنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں لالہ غنی کی پنشن مچھیرے کی جیب میں چلی گئی۔ لالہ غنی اطمینان سے اپنے گھر آ گیا۔ جیسے دِل دماغ پر پڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ گھر میں جب بیٹے نے پنشن کے بارے میں پوچھا، تو وہ خاموش رہا۔ بیٹا غُصے میں لال پیلا ہو گیا اور کہنے لگا۔

''کم سے کم اپنے کفن دفن کے لئے ہی پیسے بچا کر رکھ''۔

لالہ غنی نے جواب دیا۔

''بیٹا میرا ایمان ہے کہ کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے۔ مولا دے گا دفن کیلئے۔''۔

''پر لالہ! مولا کہاں سے دے گا۔ میری تنخواہ سے بمشکل گھر کا خرچہ چلتا ہے۔ اماں بیچاری لوگوں کے گھروں میں کام کرتی کرتی اللہ کو پیاری ہوگئی پر تُم نہیں سُدھرے۔ تمہیں شرم نہیں آئی۔ لیکن اب میں تُمہارا یہ کنجرپن برداشت نہیں کرسکتا۔ تم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اور دفع ہوجاؤ، اِس گھر سے۔''۔

لالہ غنی بیٹے کی باتیں سُن کر گھر چھوڑ کر چلا گیا، اور پھر کبھی واپس نہیں آیا اور نہ ہی بچوں نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔

پھر ایک دِن لالہ غنی کی فوتگی کی خبر سارے تالاب کھٹیکاں میں پھیل گئی۔ اُسکی لاش کو توی ندی سے اُسی مچھیرے نے نکالا تھا جسکے ساتھ لالہ غنی نے جوا کھیلا تھا اور ساری پنشن ہاردی تھی۔ جنازے میں سارا محلّہ اور جواری برادری شامل ہوئی تھی۔ رقم اُدھار لیکر بیٹے نے کفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ لالہ غنی کو دفن کرنے کے بعد جب لوگ قبرستان سے جانے لگے تو مچھیرے نے لالہ غنی سے جیتی ہوئی پنشن کی رقم اُسکے بیٹے کے حوالے کی اور کہا،

''لالہ غنی نے اپنے کفن دفن کے لئے یہ پیسے میرے پاس رکھے تھے اور مجھے کہا تھا کہ مرنے کے بعد یہ رقم تمہیں دے دُوں تا کہ تم اِن پیسوں سے ساری رسمیں پوری کرسکو۔''

مچھیرے کی بات سُنتے ہی لالہ غنی کا بیٹا پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

●

رانجھا ماہی

پنجاب سے ایک نیا بیاہتا جوڑا اپنی کار میں ہنی مون منانے کیلئے کشمیر جا رہا تھا۔ جواہر سُرنگ پار کرنے کے بعد وہ جوڑا ویری ناگ کا تاریخی چشمہ دیکھنے کیلئے چلا گیا۔ بادشاہ شاہجہان کے بنائے ہوئے خوبصورت حوض اور مغل باغ کے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو میں سیلفیاں لی گئیں اور پھر یہ جوڑا پہلگام کی طرف چل پڑا، جہاں ایک ہوٹل میں اُنکے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔

مٹن کے پُجاریوں سے سر مُنڈوانے اور عیش مقام کی درگاہ پر حاضری دینے کے بعد وہ پہلگام کی طرف جا رہے تھے کہ اُن کی کار کو کُچھ سر پھرے نوجوانوں نے روکا اور اُنھیں کار سے باہر آنے کے لئے کہا۔ دونوں میاں بیوی کار سے جب باہر آئے تو ایک نوجوان نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کِس مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا مسلک کیا ہے؟''۔

''بھائی آپ کون لوگ ہیں اور ہم میاں بیوی سے کیا چاہتے ہیں؟''۔

دولڑکوں نے کشمیری فِرن پہنے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے فِرن میں چھُپائی بندوقیں دِکھائیں اور کہا۔

''آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہم کون ہیں؟''۔

''اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟''۔

''ہم اللہ کے فضل سے مُسلمان ہیں۔ میرا نام عامر ہے اور یہ میری بیوی فرح ہے''۔

''اچھاتو پھر.... تم قرآن مجید کی کوئی آیت سناؤ''۔

میاں نے فوراً آیت پڑھ کے سنائی اور اُسکا ترجمہ بھی سُنایا۔

نام نہاد ملی ٹینٹ خوش ہو گئے اور اُنھیں یقین ہو گیا کہ دونوں مومن ہیں۔ پھر اُنہوں نے شادی شُدہ جوڑے کو جانے کی اجازت دے دی۔

دُور ______ کافی دُور جانے پر پتنی نے اپنے پتی سے پُوچھا۔

''ایک تو آپ نے اپنا اور میرا نام غلط بتایا۔ دوسرا اُنکو گائتری منتر کا ترجمہ سُنا دیا۔ آپکو اتنّ وادیوں سے ڈر نہیں لگا؟''۔

''بالکل نہیں، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ اُنہوں نے مقدس قرآن کو پڑھا نہیں ہے ۔اگر پڑھا ہوتا تو وہ اِس طرح انسانوں میں فرق نہیں کرتے''۔

پتنی نے پیار سے اپنے رانجھے کو گلے لگا لیا اور کار پہلگام کی طرف دوڑنے لگی۔

●

بگلے بھگت

برہم لوک کی لوک تانترک پرمپرا یہ تھی کہ وہاں کے پردھان کا جب دیہانت ہو جاتا تو پرجا کے پرتی نِدھیوں کی ایک میٹنگ بُلائی جاتی جو نئے پردھان کا چناؤ کرتی۔ایک بار جب برہم لوک کے پردھان کا دیہانت ہوا تو وہاں کی پرجا کے پرتی نِدھی اپنا نیا پردھان چُننے میں اسپھل رہے۔اُنکی نظروں میں کوئی نیتا جچا ہی نہیں۔راج سنگھاسن خالی رہنے کی وجہ سے جب ڈانواں ڈول ہونے لگا تو پرجا کے پرتی نِدھیوں نے فیصلہ کیا کہ اگلی صبح برہم لوک کی سرحد کے اندر جو پہلا آدمی داخل ہوگا۔۔۔اُسے راج سنگھاسن پر بٹھا دیا جائے۔

اگلی سویر برہم لوک کی سرحد کے اندر جو پہلا آدمی داخل ہوا، وہ دھرتی ماتا پر جان نچھاور کرنے والا ایک سادھو تھا۔بھگوے رنگ کا لمبا کُرتا اور ململ کی دھوتی پہنے ، ماتھے پر بھبھوت اور ہاتھ میں پیتل کا کمنڈل پکڑے ہوئے۔ پرجا کے پرتی نِدھیوں نے اپنے دھرتی پُتر کا روایتی ڈھنگ سے ہاردِک سواگت کیا اور اُسے بڑے آدر کے ساتھ راج سنگھاسن پر بٹھا دیا۔یوں سادھو مہاراج برہم لوک کے نئے پردھان بن گئے۔

سنگھاسن پر بیٹھتے ہی اُنھوں نے مردنگ بجایا اور ڈونڈی پٹوائی کہ وہ ہزاروں سال پرانی سبھیتا کے علمبردار ہونے کے ناطے برہم لوک کو پراچین سنسکرتی کے اُجّول رنگوں میں رنگ دیں گے اور بیرونی حکمرانوں کی طرف سے بنائی گئی سبھی ملیچھ نشانیاں مٹا دیں گے اور دھرتی ماتا کو پوِتّر بنا دیں گے اور برہم لوک کو ستیم ،شِوم اور سُندرم میں تبدیل کر دیں گے ،مگر راج

محل میں داخل ہوتے ہی اُنکے کمنڈل کی پیتل دھاتو سونے میں بدل گئی اور دھوتی کی ململ ریشم میں۔ اُنکے لہو کا رنگ سفید ہو گیا، ہاتھی نُما کان بہرے ہوگئے۔ آنکھیں پتھر ہوگئیں ۔اُنہوں نے برہم لوک کے سنویدھان میں سنشودن کر کے پرجاّ کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا حکم دیا جس کارن پورے برہم لوک میں ہاہا کار مچ گیا۔ منووادی سوچ کے خلاف پردرشن ہونے لگے۔ جلوسوں اور ہڑتالوں کے کارن کاروبار ٹھپ ہونے لگا۔ مُدرا کی در ِگرنے لگی۔ آرتھک ستیتھی کی ناگواری سے پرتی ِندھیوں کی دشواری بڑھنے لگی۔ مہنگائی کی مار سے پرجاّ بُھک مری کا شکار ہونے لگی۔ لیکن سادھومہاراج نے تو راج محل سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تھا۔ پردھان کے رویے کو دیکھ کر پرتی ندھی پریشان ہوگئے۔ پرجاّ گونگے اور بہرے پردھان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔ برہم لوک میں شانتی بھنگ ہونے لگی۔ چیخ و پکار کا شور راج محل کی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش ہو جاتا۔ کارن یہ تھا کہ راج محل کی دیواریں لوہے کی بنی تھیں اور لوہا بہرے کانوں تک آوازوں کی رسائی نا ممکن بنا دیتا۔ برہم لوک کی حالت دیکھ کر چور اچکّے چوہدری بن گئے لیکن سادھومہاراج کا فرمان تھا کہ اُنکا راج اہنسا پرمودھرما کی مونہہ بولتی تصویر ہے۔ پرجاّ کی دُکھدائی کیفیت اور پرتی ِندھیوں کا موہ بھنگ ہوتے دیکھ کر شترُ وایک بڑی فوج کے ساتھ برہم لوک پر چڑھ دوڑا اور سرحدی چوکیوں کو تباہ کرتا ہوا راج محل تک آپہنچا۔ شترُ و نے اگن بان توپوں اور ٹینکوں سے راج محل کی فولادی دیواریں توڑ دیں۔ پرجاّ کے پرتی ِندھی گبھرائے ہوئے یہ سُوچنا دینے پردھان کے پاس گئے لیکن سادھُومہاراج نے اُن کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ لوہے کی دیواریں ِگرتے ہی شترو اپنی فوج کے ساتھ راج محل میں داخل ہو گیا۔ پرجاّ کے پرتی ِندھی ایک بار پھر چیختے چلاتے سادھومہاراج کے پاس

پہونچے اور تازہ سِتتھی کی جانکاری دینے لگے پر بہرے اور گونگے پردھان کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی ۔ جب شترو پردھان کے سنگھاسن کی طرف بڑھنے لگا تو دُکھی پرتی بِندھی سادھو مہاراج کے پاس آئے اور اُنھیں جھنجھوڑ کر بتانے لگے کہ شترُو نے راج سنگھاسن پر قبضہ کرلیا ہے اور وہ اب آپکو بندھی بنانے کے لئے آرہا ہے۔

ایک دم سادھو مہاراج کے بہرے کان سُننے لگے ۔رگوں میں دوڑتا لہو اپنی اصلی رنگت میں آگیا۔اُس نے سیوادار سے اپنے پیتل کا کمنڈل منگوایا کہ جس پر سونے کا رنگ چڑھ گیا تھا ۔اُسے پکڑا اور پراچین کال کی پرمپرا انُوسار دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو پرنام کیا اور دھوتی سنبھالتے ہوئے اور وندے ماترم کہتے ہوئے چور دروازے سے وِندرابن کی اور چل دیئے۔

●

نئی دُنیا کا خواب

دھرتی کنکریٹ کا گھنا جنگل بن گئی۔ پہاڑوں کو کاٹ کر اور بڑے بڑے شگاف ڈال کر سڑکیں، سُرنگیں اور ڈیم بنا دیئے گئے۔ سرسبز میدانوں اور کھیت کھلیانوں میں اُونچے ، لمبے اور چوڑے کنکریٹ کے ستُون جوڑ کر سینکڑے فٹ اونچی عمارتیں کھڑی کر دی گئیں ۔ برگد، شیشم، چندن، چنار، چیڑ، ہڑر، دیودار، ببُول، ساگوان، آم، اخروٹ، رِیٹھے، آنولے ، املو کُ، بیر، جامن، لوکاٹ اور لاکھوں سایہ دار درختوں کو کاٹ کر زمین کو ننگا کر دیا۔ چراگاہوں کو بنجر بنا کر ماحول کو پراگندہ کر دیا۔ ندی، نالوں اور دریاؤں کا پانی زہریلا بنا دیا۔ کنویں، تالاب، چشمے ، ٹیلے ، کھڈیں، کھائی سب بستیوں نے ہضم کر لئے۔ صافے ، پگڑیاں ، لاچے، شلواریں ، گوٹے، کناری، پراندے، دوپٹے ، میلے ، ٹھیلے، بسنت ، بیساکھی ، گِدّے ، بھنگڑے ، ناچ نغمے ، عشقیہ داستانیں ، شبد کیرتن، بھجن ، اذان ، دُعائیہ مجلسیں ، کافیاں، ٹُھمریاں ، حمد، نعتیں ، دوہے، ٹپّے، سہرے، سہاگ، قصیدے اور مرثیے سب گُم ہو گئے۔ ساگ سبزیاں، مکئی اور باجرے کی روٹیاں، سب قصے کہانیاں بن گئیں۔ طرزِ معاشرت تبدیل ہوئی۔ ایسا تمدنی انقلاب آیا کہ دھرتی کا جغرافیہ ہی بدل گیا۔ دُنیا گلوبل گاؤں کہلانے لگی۔ ہتھیاروں کے سوداگر من مانیاں کرنے لگے۔ دو، دو، تین، تین ہزار کلووزنی بم کُرّہ ارض کا سینہ چیرنے لگے۔ راکٹ، میزائیل، ایٹم اور جراثیمی ہتھیاروں نے پرتھوی پر تباہی مچا دی۔ انسانی گوشت ، کُتے اور بھیڑیئے کھانے لگے۔ موبائیل، انٹرنیٹ ، یوٹیوب ، فیس بک ، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ ، ایل، ای ، ڈی اور ٹیلی

ویڑن چینلوں نے وہ ہنگامہ آرائی برپا کی کہ بے حیائی ہر گھر کے اندر آئی۔ بچے، جوان، بوڑھے سب نئی ایجادات کے مایا جال میں بُری طرح پھنس گئے۔ سڑکوں پر دوڑنے والی گاڑیوں کی آلودگی اور کارخانوں کی چمنیوں سے اُٹھنے والے دُھویں نے لوگوں کی سانسیں روک لیں۔ آسمان کو چھوتے ٹاوروں نے صاف وشفاف ہوا کا چلنا بند کر دیا۔ تاب کاری لہروں نے آسمان پر قبضہ کر لیا۔ کھوجی سیارچوں نے خلاء کو کھنگال ڈالا۔ پرندے آسمان پر اُڑنا بند ہو گئے۔ چڑیاں مرگئیں۔ حکمرانی کا چسکا ہرا یرے غیرے، نتھو کھیرے کو لگ گیا۔ کمزوروں پر حملے کرنا قومی فریضہ بن گیا۔ انسانی جانیں سستی ہو گئیں۔ فرعون دعویٰ کرنے لگے کہ خدا کی خُدائی نام کی کوئی چیز دُنیا میں ہے ہی نہیں۔

پھر ایک دِن، اِک نابینا وائرس پیدا ہوا۔ جنم لیتے ہی اُس کا دائرہ بڑھنے لگا، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگ مرنے لگے۔ آدمی، آدمی سے ڈرنے لگا۔ رشتے ناطے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ میاں بیوی، ماں باپ، بھائی بہن، سب نفسا نفسی میں مُبتلا ہو گئے۔ دُشمنیاں اور دوستیاں مِٹ گئیں۔ دھرتی شمشان اور قبرستان بن گئی۔ دُنیا ختم ہونے لگی۔ سائنس دانوں کی کراماتیں بے بس ہو گئیں۔ ڈاکٹر، وئید اور حکیموں کی رسد گاہیں ایک دوسرے کا مونہہ تکنے لگیں۔ تحقیقی تجربے ناکام ہوئے۔ کوئی بھی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ لوگ اس مہاماری اور ناگہانی آفت سے بچنے کیلئے پُرانے ٹوٹکے آزمانے لگے۔ ہوّن کرائے گئے۔ نذر نیازیں دینے لگے۔ لنگر لگانے لگے۔ پر رحیم، کریم، اگم قادر کہلانے والے نے رحمت اور شفقت سے ہاتھ کھینچ لئے۔ عبادت گاہوں کے ٹھیکیداروں نے اِس وائرس کو خُدائی قہر بتایا جو خلقت کی نافرمانی کی بدولت نازل ہوا۔ زندگی تھم گئی۔ صدیوں کی سائنسی ترقی خاک میں مل گئی۔ لوگ بوسیدہ

کمروں میں پڑے دھارمک گرنتھ پھڑ پھڑانے لگے۔ اللہ، ایشور تیرونام کی صدائیں دینے لگے۔ سربہ سجود ہوئے۔ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں پر شرم سار ہوئے۔ ہاتھ باندھ کر معافیاں مانگنے لگے لیکن موت کا تانڈو زندگی اُجاڑتا رہا۔ آخرش انسانی نسل ختم ہوگئی۔ کنکریٹ کا جنگل پاتال نگل گیا۔ دھرتی بے چراغ ہوگئی۔

پھر ربّ العزت نے ایک نئی کائنات سجائی۔ دوبارہ خاک سے آدم اور حوّا کو پیدا کیا۔ پرند، چرند اور جانوروں کے جوڑے پیدا کئے۔ جنگل، پہاڑ، ہرے بھرے میدان، رُوح پرور، نرم ہوائیں، صاف پانی کے چشمے، ندیاں، دریا اور سمندر، پھول بوٹے اور باغ باغیچے بنائے ___ پھر آدم کو حُکم دیا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اُسکی کائنات میں دخل نہ دے اور جو مذہب، ذات پات، رنگ اور نسل کی شناخت کو یکسر رد کردے۔ سرشٹی کو ایشور کی لیلا مانے اور صرف خُدا کی خُدائی کا وِرد کرے۔

●

زندگی کے مارے لوگ

یہ کہانی لکھنے سے پہلے میں بڑا پریشان تھا کہ اِس کا آغاز کہاں سے اور کیسے کروں۔کافی دیر تک میں اِسی مخمصے اور جھنجھلاہٹ میں مُبتلا رہا۔پھر سوچا کہ اتنی مغزماری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔چلو سیدھا کہانی لکھنی شروع کرتا ہوں۔اِس کہانی کے تین اہم کردار ہیں یعنی میں، کرنل نرمل بھاٹیہ ،میرا بیٹا کیپٹن آدرش بھاٹیہ اور رُخسانہ۔اور بھی چھوٹے موٹے کئی کردار ہیں لیکن کہانی اصل میں ہم تین کرداروں کے ساتھ جُڑی ہے جو اِس طرح شروع ہوتی ہے۔

میں بھارتی فوج کی سِگنل کور سے سن 1995ء میں ریٹائر ہوا تھا۔میرے پِتا جی اروِند بھاٹیہ بھی ایک فوجی افسر تھے اور اُنہوں نے دوسری عالمی جنگ میں انگریز فوجی بٹالین کی کمانڈ کی تھی اور تُرکی کے ایک محاذ پر نازی فوجوں کی دو چوکیوں پر قبضہ کیا تھا۔بہادری کے اِس کارنامے سے متاثر ہو کر انگریز سرکار نے پِتا جی کو رائے بہادر کا خطاب اور ملتان میں سوا ایکڑ زمین عطا کی تھی۔ مُلک کی تقسیم کے بعد پِتا جی اہلِ خانہ کے ہمراہ لاہور سے جالندھر آ گئے تھے اور ملتان والی زمین پاکستان کو دان کر آئے تھے۔پِتا جی بریگیڈیئر کے عہدے سے سُبکدوش ہوئے تھے۔اُن کی وردی اُترنے سے پہلے ہی سن 1960ء میں مجھے فوج میں کمیشن مِل گیا تھا۔ملک کے بٹوارے کے بعد میں نے اُن تینوں جنگوں میں حِصہ لیا تھا جو چین اور پاکستان کے ساتھ لڑی گئی تھیں۔جس سال میں فوج سے فارغ ہوا،اُسی سال میرا بیٹا آدرش انڈین ملٹری اکادمی ڈیرہ ڈون ،ٹریننگ کے لئے جا چُکا تھا۔میں خُوش تھا۔کیوں نہ ہوتا،ہمارے خاندان کی تیسری پیڑی دیش کی رکھشا کیلئے

فوج میں بھرتی ہوئی تھی۔

ملٹری اکادمی ڈیرہ دُون سے ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد آدرش کی پہلی پوسٹنگ کشمیر وادی کے ضلع کپواڑہ میں ہوئی تھی ، جہاں اُسے راشٹریہ رائفل کی اکیسویں بٹالین یا 21 ۔آر،آر میں لیفٹیننٹ تعینات کیا گیا تھا۔اُن دِنوں کشمیر میں جنگجوؤں نے ماحول کو وحشت ناک بنا رکھا تھا اور وہ فوج کو کبھی اپنے آگے اور کبھی پیچھے لگائے رکھتے ۔علیحدگی پسندوں کا صفایا کرنے کیلئے فوج طرح طرح کے نُسخے آزماتی رہتی۔فوج اور جنگجوؤں میں اکثر مقابلے ہوتے رہتے ۔دونوں اطراف جانی نقصان ہوتا رہتا کیونکہ توپ کے گولے ، بمنب ، گولیاں اور بارُود، فوجیوں، جنگجوؤں اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرتے۔

آدرش کے خط آتے رہتے اور ٹیلیفون پر بات چیت بھی ہوتی رہتی۔ وہ اکثر بتاتا کہ اِس دہشت گردی نے لوگوں کا جینا محال کر دیا ہے۔ دھرم ،عقیدے،رابطے اور ضابطے فوج اور جنگجوؤں نے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔دھرم کے بارے میں جو گیان اُنھیں مِلا تھا اور جو سنسکار ماں باپ سے ملے تھے وہ خاک میں مِل چکے تھے۔وہ بتا رہا تھا کہ پراکسی جنگ میں ایسا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔لوگوں کو آزادی کے بدلے بربادی ملتی ہے اور فوج جنگ جیتنے کے لئے قربانیاں دیتی ہے جبکہ سیاست خود پسندی، خودستائی اور بے حیائی میں مُبتلا رہتی ہے ۔ ہر طرف وحشت اور دہشت کا ماحول ہے ۔ زندگی ڈری سہمی ہوئی ہے اور موت موج مستی کرتی رہتی ہے۔

آدرش کیلئے یہ سب بالکل نیا تھا۔وہ پریشان رہتا لیکن بڑی ذمے داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔کپواڑہ میں اُسکے دو سال پورے ہو چُکے تھے ۔ہم اُس کی نئی پوسٹنگ

کاانتظار کررہے تھے۔ پھرایک دِن آدرش کافون آیا۔اُس نے بتایا کہ اُسکی پوسٹینگ کرگل ہونے والی ہے۔ جہاں بھارت پاک فوجوں کے درمیان جنگ چل رہی ہے۔ پھرکُچھ مہینوں بعدآدرش کی ایک طویل چِٹھی مِلی ۔جِس میں لِکھا تھا۔

''میری کرگل پوسٹینگ کاحُکم نامہ جاری ہوچُکا ہے جہاں مجھے لڑائی کے اگلے محاذپر بھیجاجارہاہے۔ مجھے 21۔آر،آر سے جلدفارغ کرنے اورکرگل ڈیوٹی پرحاضرہونے کے لئے صرف ایک ہفتے کی مہلت مِلی ہے اورتین چاردِنوں تک میں نئی پوسٹینگ پرحاضرہونے کے لئے کرگل جارہاہوں۔لیکن جانے سے پہلے آپکوایک بڑی ذمے داری سونپ کرجاناچاہتاہوں ۔جنگی محاذ پرفوجی جوان موت کے نشانے پرہوتاہے۔ کُچھ بھی انہونی ہوسکتی ہے۔باقی زندگی اورموت بے شک ایشورکے ہاتھ میں ہے لیکن بھگوان نہ کرے،اگرمُجھے کُچھ ہوگیا توآپ کومیری مونہہ بولی بہن رُخسانہ کا پورادھیان رکھناہوگا۔اُسکی پرورش اورپڑھائی لِکھائی کی ساری ذِمے داری آپکواُٹھانی ہوگی۔

رُخسانہ بڑی پیاری اورمعصوم لڑکی ہے۔میں نے دِل سے اُسے بہن مانا ہے کیونکہ میری اپنی کوئی بہن نہیں ہے۔میں پچھلے ایک سال سے اُسکی پڑھائی کاساراخرچہ اُٹھارہاہوں ۔اورجب تک وہ پڑھ لکھ کرعزّت سے روزی روٹی کمانے کے قابل نہیں ہوجاتی ،میں یہ فرض نبھاتارہوں گا۔بہن کے ناطے رُخسانہ آپکی بھی بیٹی ہے۔ایشورمہرکرے لیکن اگرمیرے ساتھ کوئی ناگہانی حادثہ ہوجائے توآپ رُخسانہ کی پرورش کریں گے ۔اُسے پڑھائیں گے اوراِس قابل بنائیں گے کہ وہ خوشحال زندگی گذارسکے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے خواب کی تعبیربنیں گے ۔رُخسانہ اِس وقت چوتھی جماعت میں پڑھ رہی ہے

۔اُس کا باپ دیہاڑی دار مزدور تھا۔ وہ رُخسانہ کو پڑھانا چاہتا تھا لیکن بھگوان کو یہ منظور نہیں تھا۔

سرحدیں پوری طرح بند کرنے ،کانٹے دار تاریں اور بارودی سُرنگیں بچھانے اور جدید حفاظتی منصوبہ بندی کرنے اور رات دِن چوکسی سے سرحد کی حفاظت کرنے کے باوجود جنگجوؤں کی آواجائی نہیں رُکتی ۔ اُنکی فوجیوں کے ساتھ جھڑپیں روز کا معمول ہے جس میں معصوم اور بے گناہ لوگ مرتے رہتے ہیں اور جب کبھی فوج یا سیکورٹی فورسز کا زیادہ جانی نقصان ہو جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں اور اندھادُھند گولیاں چلانی شروع کر دیتی ہیں، جس کی وجہ سے عوام کا غصہ بھڑک اُٹھتا ہے کیونکہ اُنکے سگے مرتے ہیں ۔ اُن کا دودھ اور لہُو سڑکوں اور گلیوں میں بہتا ہے۔ جلسے، جلوس نکلنے شروع ہو جاتے ہیں ۔ دھرتی کالا کفن اوڑھ لیتی ہے ۔آسمان سے آگ کے شرارے گرنے لگتے ہیں ۔ وادی کی خوبصورتی بدصورتی کا لباس پہن لیتی ہے۔ لوگوں کا نصیبا سُولی چڑھنے لگتا ہے ۔ بہار رُت خزاں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حاکم کی آنکھ، کانوں سے دیکھتی ہے۔ دانت کٹکٹا کر فیصلے کرتی ہے۔ کم سِن بچوں کا کھیل ''اکڑ بکڑ'' ..... پکڑ دھکڑ پر ختم ہوتا ہے ۔فوجی اور پولیس والے بچوں اور جوانوں کو اذیتیں دے کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیتے ہیں ۔لیکن حاکموں کو کون سمجھائے کہ جیل کوٹھریاں اور پھانسیاں جذبوں کو **کچلتی** نہیں بلکہ شعلوں کو بھڑکاتی ہیں۔ جوالا مُکھی کو جنم دیتی ہیں ۔ حاکموں کو کون تاریخ پڑھائے اور سمجھائے کہ انسانوں کا شکار طاقت، دہشت اور نفرت سے نہیں بلکہ پیار، محبت اور ہمدردی سے کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح عوام کو کون سمجھائے کہ نہ مُلاّ جنگل جائے اور نہ چیتا مسجد آئے۔ ہر چیز یہاں بے اعتباری لگتی ہے ۔ میں نے سُنا ہے کہ جب ذُلفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو لوگوں نے

جنرل ضیاالحق کے خلاف بڑے بڑے جلوس نکالے اور وہابیوں اور جماعت اسلامی والوں کے چھ سات سو مکانات جلا ڈالے۔ ایسے ہی جب صدر ضیا ہوائی حادثے میں ہلاک ہوا تھا تو بھی لوگ سڑکوں پر اُتر آئے تھے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ ساری قوم ہی انتشار کا شکار ہے۔ یہاں کے موسم کی طرح لوگوں کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ اونٹ کب کِس کروٹ بیٹھے۔ سیاسی، مذہبی اور سماجی موسم تو یہاں ہمیشہ بے اعتبارا ہی رہا ہے۔ کبھی خوشی پرائی اور ناچ خُدائی کے منظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور کبھی جلتی سڑتی، لہو رنگی دھرتی کو دیکھ کر بین کرتے جلوس ______ اُداسی اتنی پھیل جاتی ہے کہ مسکراہٹ کہیں بھی دِکھائی نہیں دیتی۔

ایسے ہی ایک جلوس کی بلّی رُخسانہ کا باپ غلام علی بھی چڑھ گیا تھا۔ وہ بیچارا مزدوری کر کے گھر واپس آ رہا تھا کہ میری یونٹ کے ایک جوان نے اُس کے سر میں گولی ماردی اور موقع پر ہی اُسکی سانسوں کی چھنکار بند ہوگئی۔ جلوس مُنتشر ہو گیا تھا۔ جوان خوش تھے، جیسے اُنہوں نے جگّا ماردیا ہو۔ ایک بے گناہ کی موت دیکھ کر میرا ضمیر بہت دیر تک مجھے کوستا رہا۔ پھر ایک دِن میں اپنے حفاظتی عملے کے ساتھ کلتورا گاؤں گیا، غلام علی کے گھر افسوس کرنے کیلیئے۔ گھاس پھُوس کی چھت سے ڈھکا اور لکڑی کی تختہ بندی سے بنے چھوٹے سے مکان پر مٹی سے لِپائی کی ہوئی اور اندر رُخسانہ اور اُسکی ماں فاطمہ چٹائی پر بیٹھی ہوئیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب، چہروں پر اُداسی اور بے بسی۔ مُجھے دیکھتے ہی دونوں بین کرنے لگیں۔ چھاتی پیٹنے لگیں اور غُلام علی کو مارنے والے کو بددُعائیں دینے لگیں۔ اُنکو ماتم کرتے دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں ماں بیٹی کو دِلاسہ دینے لگا۔

''غلام علی کی موت کا ہمیں بھی بہت دُکھ ہے۔''

''آپ لوگوں کو؟......... آپکو کیسا دُکھ۔آپ لوگ تو شکاری کُتّوں کی طرح انسانوں کا شکار کرتے ہو۔معصوم، بے گناہوں کو مار کر اپنی چھاتیاں چوڑی کرتے ہو۔اُنھیں اُگروادی ثابت کر کے انعام اور ترقیاں حاصل کرتے ہو۔آپ قاتل بھی خود ہیں اور مُنصف بھی خُود۔ہم کمزور، بے بس ،لاچار، لاوارث اور آپ .... تکڑے ،طاقتور، فوجدار۔جبکہ ہمارا کرب ،ہمارا درد، ہماری بے بسی اور بے کسی ایک مذاق۔''۔فاطمہ اپنے دِل کا اُبال نکال رہی تھی۔وہ نصیبوں جلی حالات کی دلدل میں بُری طرح پھنسی تھی۔میں اُسے سمجھانے لگا۔

''درد دِل کی شدّت سے زیادہ دیر دُکھی نہیں ہونا چاہیئے۔کیونکہ جو دریا چڑھتے ہیں وہ جلدی اُتر بھی جاتے ہیں۔اِسلیئے اِس تکلیف دہ سانحہ کو بھُول کر نئی زندگی شروع کرو۔غلام علی کا سپنا پُورا کرو۔رُخسانہ کی تعلیم پر دھیان دو۔میری کوئی بہن نہیں ہے۔اِس لئے آج سے رُخسانہ کو میں اپنی بہن بناتا ہوں۔میں اِس کی پڑھائی کی ذمے داری اپنے سر لیتا ہوں۔''۔

''فوجی بابو! دریا جلدی چڑھتے اور اُترتے ہوں گے پر لوگوں کو تنکوں کی طرح بہالے جاتے ہیں۔اُنکی زندگیاں اُجاڑ دیتے ہیں۔گھروں میں بھُوک اور بیماری کی لاچاری اُنھیں خستہ کر دیتی ہے۔اس لئے شلغم پر سے مٹی جھاڑنا چھوڑ دو۔آپ کا انصاف یہ ہے کہ کرے مونچھوں والا اور مرے داڑھی والا۔آپ لوگ گولی چلانے سے پہلے یہ نہیں سوچتے کہ مرنے والا اکیلا نہیں مرتا۔اُس کے ساتھ کئی زندگیاں مرتی ہیں۔کیونکہ وہ کِسی کا بیٹا، کِسی کا باپ، کِسی کا بھائی اور کِسی کا خاوند ہوتا ہے۔اِس لئے مجھے میرے حال

پر چھوڑ دو۔ میرے مقدّر میں جو لِکھا تھا سو مِل گیا۔ آگے کا بھی اللہ مالک ہے۔ پھر سیانے بھی تو کہتے ہیں کہ ٹڈی دل سے یاری کیسی"۔ فاطمہ اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"دیکھو بی بی! ہم پتھر نہیں ہیں۔ ہمارے اندر بھی دِل دھڑکتا ہے۔ ہم بھی انسان ہیں اور انسانوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہم اپنے سپاہی کی حرکت کے لئے معافی مانگتے ہیں۔ ہم نے اُسکی وردی اُتروالی ہے اور اُسکا کورٹ مارشل کردیا ہے۔ میں آپکو انصاف دلاؤں گا اور غلام علی کی ہلاکت کا ہرجانہ بھی۔" میں نے اُن کے لئے آٹا، چاول، تیل، دالیں اور کھانے پینے کا کُچھ اور سامان لایا تھا جو میں نے فاطمہ کے حوالے کیا اور کُچھ رقم بھی دی تا کہ اُنکا چولہا جلتا رہے۔ جانے سے قبل میں نے ایک بار پھر فاطمہ کو یقین دلایا کہ آج کے بعد رُخسانہ کی پرورش میری ذمے داری ہے۔____ میں نے فاطمہ کو غلام علی کی حادثاتی موت کا ہرجانہ بھی دِلایا اور فوج کی سدبھاونا سکیم کے تحت گھر چلانے کیلئے دو ہزار روپے مہینے کا وظیفہ بھی لگوادیا____ رُخسانہ کے تعلیمی اخراجات کیلئے اپنی تنخواہ سے میں ہر مہینے خرچہ دے رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا یا کررہا ہوں وہ اپنے ضمیر کو مُطمئن کرنے کیلئے کررہا ہوں جو شکست خوردہ ہوگیا ہے۔ فاطمہ اور رخسانہ کا کوئی رشتے دار نہیں۔ نہ بہن نہ بھائی اور نہ ہی سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا کوئی ہمدرد۔ غُلام علی اپنے والدین کا اِکلوتا بیٹا تھا اور فاطمہ ایک یتیم لڑکی۔ آگے اِن دونوں کی اِکلوتی بیٹی رُخسانہ۔ اِس لئے رُخسانہ کو آپ کے حوالے کررہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ رُخسانہ کی ذمے داری قبول کریں گے۔ اور اُسے پدری شفقت سے نوازیں گے۔" ___ چٹھی پڑھ کر میرا سینہ چوڑا ہوگیا اور سر فخر سے اُونچا۔ رُخسانہ کو اپنا کر اُس نے انسانیت کا پرچم بُلند کیا تھا اور فوج

کی روایت کو بھی زندہ رکھا تھا۔ میرا بیٹا ضمیر کی کچہری میں گیا تھا جہاں کبھی غلط فیصلے نہیں ہوتے۔ میں نے آدرش کے فیصلے کو صدق دِلی سے سراہا۔

آدرش کی پرموشن ہوگئی تھی۔ وہ اب کیپٹن بن گیا تھا اور کرگل کے جنگی محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔ کبھی کبھی اُسکا فون آجاتا اور سُکھ سلامتی کا پتہ چل جاتا۔ کرگل کی لڑائی میں دونوں اطراف سے توپیں اور ٹینک آگ برسا رہے تھے۔ دشمن فوجوں سے اپنی چوکیاں واپس قبضے میں لینے کے لئے زوردار حملے ہو رہے تھے۔ بٹالک محاذ پر ایک سرحدی چوکی کو واپس لینے کی کارروائی میں میرا آدرش شہید ہوگیا۔ اِس دِل سوز سانحے کی اطلاع مُجھے فوجی ہیڈکوارٹر سے مِل چُکی تھی اور دو دِنوں بعد ہیلی کاپٹر سے اُس کا پارتک شریر بھی جالندھر پہنچ گیا تھا۔ اُسکا انتم سنسکار پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ہوا۔ سارا شہر ارتھی کو لکڑی دینے اُمڈ آیا تھا، لیکن میری دُنیا اُجڑ چکی تھی۔ اپنے جوان بیٹے کی شہادت نے میرے سانس نیلے کر دیئے تھے۔ موت کا اجگر میرا کلیجہ نکال کر لے گیا تھا۔ دِل پر لگیں خراشوں کو میں صبر کی ہلدی کا لیپ لگاتا رہا۔ میرے زخم آہستہ آہستہ بھرنے لگے لیکن آدرش کی ماں اِس صدمے کو برداشت نہ کرسکی اور بیٹے کی آتما سے جا ملی۔ میرے پاس صرف اُن کی یادیں رہ گئیں یا پھر آدرش کا مہاویر چکر اور کُچھ دیگر میڈل و اسناد۔ اپنے جگر پارے کو کھونے کے بعد میں ایک مُدت تک اپنے اندر کی جنگ لڑتا رہا۔ دِل دریا میں غوطے کھاتا رہا۔

میرے اندر یہ احساس شِدّت سے جڑ پکڑنے لگا کہ جنگ کیوں اور کِس لئے۔ زمین کے لئے، جو کبھی کِسی کی نہیں ہوئی۔ اُس پر دعویٰ کرنے والے مرکھپ گئے لیکن زمین نے کسی سے وفا نہیں کی۔ وہ کبھی تقسیم نہیں ہوئی۔ نہ دارا، سکندر، نہ چنگیز، ہلاکو، نہ تیمور اور ہٹلر زمین

کا بٹوارہ کر سکے۔ پھر دھرتی پر لوگوں کا اُجاڑ کیوں۔ انسانی لاشوں پر سیاسی بربریت کا کھیل کِس لئے۔ پاگل ہوائیں کب تک چلتی رہیں گی۔ وِیرتا اور وِیرگتی کی کہانیاں کب تک لوگوں کو بیوقوف بناتی رہیں گی۔ نفرت اور حقارت کے بول کب تک امن اور شانتی کی شہنائی کو بے سُرا بناتے رہیں گے۔ بدحالی کب تک خوشحالی کی فصل برباد کرتی رہے گی۔ کئی دِنوں تک میں اپنے اندر اُٹھے جوار بھاٹا سے لڑتا رہا۔ پھر میں، کرنل نرمل بھاٹیہ ...... اِس بھنور سے باہر نِکل آیا۔ مجھے گوتم کے بول یاد آنے لگے کہ ساری دُنیا دُکھوں کا گھر ہے اور دُکھیوں کے دُکھ دُور کرنا ہی سیوا پھل ہے۔ میں اپنی سوچ کی کُٹیا میں پھُولوں کی کیاری سجانے لگا۔ میں محبت کی چابی سے دِلوں پر لگے زنگ آلود جندرے کھولنے لگا۔ میں انسانیت کا دیپ جلا کر اندھیروں میں اُجالے روشن کرنے لگا۔ اب آدرش کا سپنا میری زندگی کا مقصد بن گیا، اور رُخسانہ میرے جینے کا سہارا۔ رُخسانہ کیلئے میرے دِل میں پیار اور دُلار موجیں مارنے لگا۔ میں اُسکے گاؤں گیا۔ اُسکی ماں فاطمہ سے مِلا۔ آدرش کی شہادت کے بارے میں بتایا۔ دونوں ماں بیٹی رونے لگیں۔ بڑی مُشکل سے میں نے اُنکو اِس صدمے سے باہر نکالا اور یقین دِلایا کہ آدرش کے خواب کو میں نے اپنی آنکھوں میں سجا لیا ہے۔ اب رُخسانہ میری ذمے داری ہے۔ میں رُخسانہ کو پڑھاؤں گا اور اُسے اچھی زندگی دینے کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھاؤں گا۔ فاطمہ کی مرضی سے میں نے رُخسانہ کا داخلہ کپواڑہ میں پوٹشا آرمی سکول میں کرا دیا اور اُس کی رہائش کا بندوبست سکول ہوسٹل میں کروا دیا تاکہ وہ سکون سے پڑھ سکے اور دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ رُخسانہ نے آرمی سکول سے میٹرک کا امتحان پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ پھر میں نے اُسکا داخلہ سری نگر کے دہلی پبلک سکول میں کرایا اور اندرا نگر کالونی میں ماں بیٹی کیلئے دو کمروں کا فلیٹ

کرایے پر لے کردیا۔ اپنے اندر کے تلاطُم کوشانت کرنے کے لئے میں نے اپنے ایک ہمنوا اور بچپن کے دوست کے ساتھ مِل کر یتیم اور بے سہارا بچوں کی تعلیم وتربیت اور پالن پوسن کیلئے ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم بنائی۔ مُثبت سوچ والے کئی مخیّر حضرات ہمارے ساتھ جُڑنے لگے۔ جلد ہی ہمارے کام کی تعریف ملک بھر میں ہونے لگی۔ سماج سُدھار کی کئی تنظیمیں ہماری مالی امداد بھی کرنے لگیں۔ اپنے ماں باپ اور آدرش کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے رُخسانہ نے خُوب محنت کی اور بارویں جماعت بھی امتیازی پوزیشن حاصل کر کے پاس کی۔ وہ میڈیکل پروفیشن میں جانا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے بوتے پر میڈیکل سیٹ نکالی اور سری نگر میڈیکل کالج کی طالبہ بن گئی۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ رُخسانہ کو اپنے ماحول اور بُو دوباش سے الگ رکھوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ پاؤں تلے اپنی زمین ہی اچھی لگتی ہے۔ ہمارے قائم کردہ ادارے کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ مُلک کی کئی ریاستوں سے بے سہارا بچے یہاں پل رہے تھے۔ فرقہ وارانہ دنگوں اور دہشت گردی سے مُتاثرہ بچوں کی خدمت کر کے میرے من کو سکُون ملتا۔

رُخسانہ نے میڈیکل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایم ڈی کی سیٹ بھی اپنی قابلیت کے بل پر نکالی اور صورہ میڈیکل انسٹچوٹ سے ایم، ڈی کرنے کے بعد اِسی مثالی ادارے میں نوکری کرنے لگی۔ میں خوش تھا۔ فاطمہ خوش تھی۔ بیٹی کی کامیابی دیکھ کر فاطمہ شُکرانے کے نفل پڑھتی رہتی۔ لیکن خالق کی خلقت خوش نہیں تھی۔ اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی حالات جُوں کے تُوں تھے۔ جلسے، جلوُس، نعرے، پتھر، بمب، گولیاں آج بھی برسا کرتیں۔ زندگی آج بھی ڈری سہمی تھی اور موت آج بھی دندنا رہی تھی۔ طاقت، نفرت اور دہشت کے

جھگڑ آج بھی اُسی طرح جھُل رہے تھے اور انسانیت آج بھی جھُلس رہی تھی۔

____ پھر رُخسانہ کی شادی کے لئے رشتے آنے لگے۔ آخر برادری کے ہی ایک من پسند نوجوان ڈاکٹر اصغر سے اُسکا رشتہ طے ہو گیا جو اُسی کے ساتھ صورہ ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ شادی کی تاریخ پکی ہونے کے بعد میں رُخسانہ کی خوشیوں کا حصہ بننے کے لئے سری نگر آیا۔ رُخسانہ اور اُسکے ہونے والے شوہر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سادگی سے نکاح کریں گے۔ لیکن نکاح والے دِن رُخسانہ اور اصغر کو ہسپتال کے حاکمِ اعلیٰ نے ایمرجنسی ڈیوٹی کیلئے فوری طور طلب کر لیا۔ کیوں کہ لال بازار اور جامع مسجد کے علاقوں میں مظاہرین پر پیلٹ گن اور اسالٹ رائفلوں سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ جن میں کئی لوگ مارے گئے تھے اور بڑی تعداد میں زخمی ہوئے تھے۔ رُخسانہ اور اصغر ساری رات زخمیوں کا علاج کرتے رہے۔ صبح جب وہ گھر پہنچے تو دونوں تھکے ہارے، اور حالات سے مُضطرب تھے۔ مُجھے دیکھ کر رُخسانہ میری طرف دوڑی، اور گلے لگ کر رونے لگی اور کہنے لگی۔

''ڈیڈی! کُچھ نہیں بدلا۔ آج بھی نہتے غلام علی گولیاں کھا رہے ہیں۔ آج بھی معصوم اور بے گُناہ مر رہے ہیں۔ آپ کِتنے یتیموں کا پالن پوسن کریں گے۔ کِتنوں کے گھر آباد کریں گے۔ آپ تھک جائیں گے۔ جیسے ہم تھک چُکے ہیں۔

لاگا پگڑی میں داغ

باپُو کے تین بندر اُداس، خاموش، ڈرے اور سہمے، آپس میں اشاروں کی زبان میں باتیں کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمارے باپُو نے تو کہا تھا کہ ''بُرا نہ بولو، بُرا نہ سُنو، اور بُرا نہ دیکھو'' ...... لیکن جو کُچھ آج دیش کے کونے کونے میں ہو رہا ہے، اُس سے کیسے آنکھیں موندلی جائیں ۔کانوں میں کیسے روئی ٹھونسی جائے اور کیسے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ پھر ایک بندر کہنے لگا،

''تم دونوں نے کل دیکھا کہ کیسے ہماری آنکھوں کے سامنے سچ بولنے پر گئور کھشا سمتی والوں نے ایک شخص کی لاٹھیوں اور ہاکیوں سے تب تک پٹائی کی جب تک کہ وہ مر نہیں گیا ۔وہ بونس ملنے کی خوشی میں ایک کلو بکرے کا گوشت لے کر گھر جا رہا تھا کہ راستے میں گئو ماتا کے جیالے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لاکھ چلاتا رہا کہ اُسکے پاس بکرے کا گوشت ہے، گائے کا نہیں لیکن گئور کھشک اُسکی دُھنائی کرتے رہے اور کہتے رہے کہ بھارت میں کوئی بھی بیف نہیں کھا سکتا۔ وہ روتے بِلکتے اُن سے کہتا رہا کہ اگر مارنا ہی ہے تو ستیش اور اتل سبھر وال، سُنیل کپور، مدن ابوٹ اور ہندرا جیسے گئو ہتھیا کرنے والوں کو ماریں جو الکبیر، النور اور کئی دوسرے مُسلم ناموں کے برانڈ سے گائے بیل اور بھینسے کاٹنے کے بڑے بڑے کارخانوں کے مالک ہیں اور یہ گوشت دوسرے ممالک کو بیچ کر اربوں روپے کا زرِ مبادلہ سرکار کو کما کر دیتے ہیں۔ وہ لگاتار اُس پر لاٹھیاں برساتے رہے اور کہتے رہے۔

''سالے! تو اُن کا ماما لگتا ہے۔ کوئی بھی ہندو گئو ہتھیا نہیں کر سکتا''۔ اُسکو بچانے کے لئے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ اُسکی لہولہان رُوح جسم کے پنجر کو چھوڑ کر آسمان کو پرواز کر گئی۔ پولیس دُور کھڑی تماشہ دیکھتی رہی ۔راہ گیر یہ منظر دیکھ کر تیزی سے آگے چل

دیئے۔ بھلا پرائی آگ میں کوئی کیوں ہاتھ جلائے۔ کاروں، موٹر سائیکلوں اور سکوٹر سواروں نے بھی اِس دردناک سانحے کو دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ چوراہے پر بیٹھی اور سڑک پر چلنے والی بھیڑ بے حِس تھی۔ اُس غریب کی زندگی ماٹی چاٹ گئی، جیسے انسان نہیں کوئی جانور مرا ہو۔"________ دوسرا بندر بولنے لگا،

"ہمارے سامنے ہی تو پرسوں ایک آدمی نے دوسرے آدمی کا قتل ہوتے دیکھا۔ قاتلوں نے اُسکو بھی مار دیا تاکہ کوئی بھی چشم دِید عدالت میں گواہی دینے کے لئے زندہ نہ رہ سکے۔ معاملہ عِشق مُشک کا تھا۔ جِسے آج کل لوٗ جہاد کہتے ہیں۔ ایک بالغ لڑکا اور لڑکی شادی کر کے اپنی مرضی سے زندگی گذارنا چاہتے تھے لیکن اُن کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ دونوں الگ الگ عقیدوں سے جُڑے ہوئے تھے۔ اِس طرح کی پابندی ممبئی، کلکتہ اور دیگر بڑے شہروں میں رہنے والے امیرزادوں، امیرزادیوں، فلمی ستاروں اور سیاسی لیڈروں پر لاگو نہیں ہوتی۔ دوسرے مذاہب میں اِنکی شادیاں کُھلے پن کا ثبوت ہوتی ہیں جبکہ غریب اور مڈل کلاس سوسائٹی میں اِسے لوٗ جہاد کہا جاتا ہے اِسی لئے عاشق نامراد اور واردات دیکھنے والے چشم دِید، دونوں کو مار دیا گیا۔ قتل والی جگہ پر دو لاشوں کو خُون میں لت پت دیکھ کر لوگوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ فیصلہ لیا کہ اُنہوں نے کُچھ نہیں دیکھا.... اور پھر سبھی وہاں سے بھاگ گئے۔"

تیسرا بندر سُنانے لگا

"آپ کو یاد ہوگا کہ چند دِن پہلے ایک عورت باپوٗ کی مورتی کے سامنے رو رو کر بین کر رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ اُسکی بیٹی کو اُسکے سُسرال والوں نے جہیز کم لانے کے جُرم میں پیٹرول چِھڑک کر جلا ڈالا۔ وہ مدد کے لئے فریاد کر رہی تھی اور بولے جا رہی تھی۔

''میری لاڈلی بیٹی کالج لیکچرار تھی ۔اُس نے انگریزی ادب میں پی ،ایچ ،ڈی کی تھی۔وہ میری کماؤ بیٹی تھی۔میں نے اُسکی شادی میں اپنی حیثیت سے زیادہ جہیز دیا لیکن وہ اپنے پتی اور ساس سُسر کی لالچی فِطرت کی بھینٹ چڑھ گئی ۔اُسے اکثر مارا پیٹا جاتا۔جب تک سُسرالیوں کی مانگ پوری نہ ہوتی تب تک اُس بیچاری کی خلاصی نہیں ہوتی ۔اُنکی مانگیں پوری کرتے کرتے ہم تھک چُکے تھے لیکن اُنکے لالچ کا کشکول ہمیشہ خالی رہتا۔اوپر سے داماد کے کئی لڑکیوں کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی تھے جسکی وجہ سے اکثر وہ میری بیٹی کی پٹائی کرتا۔اُن کا گھر سوروں کا باڑا تھا اور اُن سوروں نے میری لاڈو کو جلا ڈالا۔پولیس کچھ نہیں کررہی ۔شاید اِسی لئے لوگ بیٹیوں کو کوکھ میں ہی مار دیتے ہیں۔'' وہ بولے جارہی تھی ۔راستے کے مسافر کُچھ دیر کیلئے رُکتے ۔اُسکی آدھی ادھوری بات سُنتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔سب کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے کُچھ نہیں سُنا۔''

ایک دوسرے کی باتیں سُن کر تینوں بندر بہت دُکھی تھے۔وہ اِس اِنسانی جنگل میں قدروں، قیمتوں اور آدرشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چُکے تھے۔اُنکی آنکھیں اشرف المخلوقات کا درجہ رکھنے والے انسانی معاشرے کے سُنہرے اصولوں کو دیکھنے اور پرکھنے کیلئے ترس رہی تھیں ۔وہ اچھی طرح سے سمجھ گئے تھے کہ اِس گھٹیا معاشرے میں کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے ۔لہٰذا اُنھوں نے سر جوڑ کر سوچا اور فیصلہ کیا کہ اِس جھوٹی اور مکار دُنیا میں سچ کی گلی سڑی لاش کو باپو کی سمادھی کے سامنے دفن کردیا جائے ______ اور پھر رات کے اندھیرے میں اُنھوں یہ کام کرکے اپنے من کو سکون بخشنے کی کوشش کی۔

جانگلوس

تیز ہوا، موسلا دار بارش، بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک نے قیامت مچائی ہوئی تھی۔ اِسکے باوجود میں ویران جنگلوں میں صدیوں پُرانی اُن پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا جو میرے سُسرال تک جاتی ہیں۔ شہروں میں پُرانے راستے نئی کُشادہ سڑکوں میں تبدیل ہو چکے ہیں لیکن دیہاتوں کی خستہ حالی میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ آج بھی اِن دیہاتوں میں ترقی نام کی کوئی چیز دِکھائی نہیں دیتی۔ اِن پیدل پگڈنڈیوں سے میری پہلی مُلاقات تقریباً چار سال پہلے ہوئی تھی جب اِن دشوار گذار راستوں سے میری بارات گذری تھی۔ آگے آگے ایک ڈھول والا، ایک بین بجانے والا اور ایک لوہے کی گھنٹی بجانے والا اور دو ناچنے والے بھانڈ۔ بین والا ہمارے ڈُگر دیش کے مشہور لوک گیتوں کی دُھنیں بجا رہا تھا اور ڈھول کی تھاپ پر میرے دوست ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔

''ہو ماڑے گدیّا، اجیں دی راتیں رہو

چھِلڑو وی دینی آں، بکرُو وی دینی آں

کھانے گی دینی آں گھئیو،

ہو ماڑے گدیّا، اجیں دی راتیں رہو''

میں ایک پڑھا لِکھا گدّی بارات لے کر لاٹی گیا تھا۔ میرے سُسرال والوں نے غریبی دعوے کے ساتھ بارات کی آؤ بھگت کی تھی۔ چنے اور ماش کی دال اور دیسی چاول پروسے گئے۔ سونے کیلئے گھاس اور پرال پر کمبل اور چادریں بچھا کر دیں۔ صُبحِ صادق ایک گدّن

مٹیار کے ساتھ میں نے اگنی کے گرد سات پھیرے لئے اور پھر اِنہی راہوں پر چلتے ہوئے ہم واپس اُدھمپور آگئے تھے۔ اُن چار سالوں کے دوران میں کئی بار لاٹی گیا تھا بلکہ وہاں سے کبھی کبھار اپنے ننھیال سگاڑی بھی چلا جاتا تھا۔ اب اِن مُشکل راستوں سے میرا گہرا رِشتہ جُڑ چُکا تھا۔ اب یہ پگڈنڈیاں میرے لئے بیگانی نہیں تھیں۔

اب کی بار میں موسمِ گرما کی چھٹیوں میں اپنی پتنی کو لاٹی چھوڑ آیا تھا تا کہ آگ اُگلتی گرمی سے کُچھ دیر کے لئے اُسے راحت مِل سکے اور وہ اپنی خالہ زاد بہن کی شادی میں بھی شِرکت کر سکے۔ جب برسات کا موسم شروع ہُوا تو میں اپنی پتنی کو واپس گھر لے جانے کیلئے سُدھ مہادیو جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ بشٹ اور گوری کُنڈ کے بیچ بس خراب ہوگئی۔ ڈرائیور نے مکینک کو لانے کیلئے اپنے کنڈ یکٹر کو چنہنی بھیجا۔ مستری کے آنے پر ہی بس ٹھیک ہوئی، جس میں تین چار گھنٹے ضائع ہو گئے۔ بس تقریباً دو بجے سُدھ مہادیو پہنچی۔ میں نے وہاں ایک ڈھابے پر کھانا کھایا۔ ڈھابے میں ایک سرکاری افسر ملا جو اپنی جیپ میں مان تلائی جا رہا تھا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں لاٹی جا رہا ہوں تو اُس نے مجھے مان تلائی تک لِفٹ دے دی۔ وہاں سے میں نے بمُشکل سات آٹھ کلومیٹر پیدل سفر طے کیا ہوگا کہ ایک دم جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ بادل گرجنے لگے اور پھر بارش کے طوفان نے قیامت ڈھا دی۔ بادلوں کی گرج اور آسمانی بجلی کے کوندنے سے دِل کانپ رہا تھا لیکن میں رُکا نہیں۔ اپنا سفر جاری رکھا۔ میں چاہتا تھا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے میں لاٹی پہنچ جاؤں...... اپنے سُسرال........ اپنی گدّن کے پاس، جِسے مائیکے گئے ہوئے ایک مہینہ ہو چُکا تھا اور جِسے ملنے کے لئے میرا دِل بے قرار تھا۔ میں راستے میں ستانے کے لئے کہیں

نہیں رُکا اور چلتا رہا۔ بازو پر بندھی میری گھڑی چھ بجا رہی تھی اور طوفانی بارش دِن کی روشنی کو تاریکی میں بدل رہی تھی۔ ماحول بہت خوفناک بنا ہوا تھا مگر میرا سفر جاری تھا۔ دیوداروں کے جھُنڈ سے ڈھکا لاٹی کا خوبصورت گاؤں....... اُس پر میرے سُسر کا کچا کوٹھا..... اور کوٹھے کے اندر میری پیاری گدّن کسی ٹوٹی پھُوٹی چارپائی پر مست نیند سوئی ہوئی۔ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے اور میں ایک سارس، اُڑ کر اُس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا، بنیک، مروٹھی اور کوئیا کی پگڈنڈیاں میرا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ میں اکیلا جنگل بیابان میں چلتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا کہ میں خود ایک طوفان ہوں، ایک سیلاب، ایک گرجتا بادل، ایک کڑکتی بجلی..... گرنے کو بیتاب....... رات کی سیاہی پھیل چکی تھی ۔ہاتھ میں چیڑ کی لکڑی کے تراشوں کی گڈی جلائے، میں چل رہا تھا تاکہ راستہ بھٹک نہ جاؤں۔ مجھے دُور پنگارا گاؤں کے ایک گھر میں دیا جلتا دِکھائی دیا۔ پنگارا..... ہاں، یہی وہ گاؤں تھا جہاں میرے ساتھ زندگی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا اور جس کے بارے میں پوری تفصیل...... بس میں ابھی بتاتا ہُوں۔ اِس گاؤں سے لاٹی اب بھی تقریباً چھ کلومیٹر دُور تھا۔ بارش کا متواتر برسنا، اندھیری رات اور تھکاوٹ کی وجہ سے میرا لاٹی پہنچنا بہت مُشکل تھا۔ اِس لئے میں اُس گھر کی طرف چل دیا جہاں دِیا جل رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کُنڈی کھُلی ہے۔ دروازہ کھول کر اندر آجاؤ''۔ ایک آواز آئی۔ میں نے دروازے کا پٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایک عورت اور مرد چولہے کے پاس بیٹھے آگ سینک رہے تھے۔

''میں نے لاٹی جانا ہے۔ باہر زوروں کا مینہہ پڑ رہا ہے۔ اندھیرے میں راستہ بالکل دِکھائی

نہیں دے رہا۔ کیا مجھے رات گذارنے کے لئے پناہ مِلے گی۔''۔

''تُم کون ہو؟''______ ''ایک اِنسان''۔

''وہ تو مجھے بھی دِکھائی دے رہا ہے۔ مگر تمہاری ذات کیا ہے۔ لاٹی میں تم نے کِس کے گھر جانا ہے۔''

''میں گدیّوں کا لڑکا ہوں۔ لاٹی میں میری شادی ہوئی ہے۔ میرے سُسر کا نام کِرپو ہے۔''۔

''اچھا، تو تُم بھائی کِرپو کے داماد ہو۔ پھر تو تم ہمارے بھی داماد ہوئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ تُم ہمارے گھر میں رات گذار رہے ہو۔''۔

اُس نے انگیٹھی گرم کی اور کہا۔

''آگ سینک لو۔ باہر کڑاکے کی ٹھنڈ ہے۔ تمہارے کپڑے بھی گیلے ہیں۔ یہ کمبل اوڑھ لو اور اپنے کپڑے سُکھا لو''۔

باتوں باتوں میں مجھے معلوم پڑا کہ یہ مُسلمانوں کا گھر ہے۔ اُنہوں نے مُجھے سرسوں کا ساگ اور لسوڑے کے آچار کے ساتھ مکئی کی روٹی کھلائی اور پھر ایک چھوٹے سے کچے کمرے میں سونے کیلئے بھیج دیا جہاں چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا۔ میں بہت لمبا سفر کر کے آیا تھا اور کافی تھکا ہوا تھا۔ بستر پر پڑتے ہی گہری نیند سو گیا۔ رات کے آخری پہر اچانک آنکھ کھُل گئی ۔کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ بارش کا شور ابھی بھی سُنائی دے رہا تھا۔ میں سر کے نیچے رکھے کوٹ میں سے ماچس کی ڈبیہ نکالنے لگا مگر وہ خالی تھی۔ میں پہلو بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک کمرے کی کھڑکی کھُلنے کی آواز آئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمبا سا یہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی چور ہے اور سونے کا ہار چُرانے آیا ہے جو میں

ماں سے چوری اپنی گدّن کیلئے لایا تھا۔ میں اُسے پکڑنے کیلئے بستر سے نکلنے ہی لگا تھا کہ اُسکی رُعب دار آواز سُنائی دی۔

''مُجھے چھونے کی غلطی نہ کرنا۔ میں چور نہیں ہوں۔ میری آواز ایک مرے ہوئے مظلوم کی آواز ہے۔ میں تم سے ضروری بات کرنی چاہتا ہوں۔'' ___ یہ سُنتے ہی میرا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ کپکپاہٹ سے میرے پسینے چھوٹ گئے۔ مجھے لگا جیسے میں ایک سپنا دیکھ رہا ہوں۔ لیکن وہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک انسانی رُوح کی پرچھائیں تھی جو مجھ سے مخاطب تھی۔

''میں تمھیں صرف اپنی کہانی سُنانی چاہتا ہوں۔ تُم ہوش میں آوٴ۔ ڈرو مت۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اِس لئے غور سے میری بات سُنو۔ میں بندھول کا رہنے والا تھا۔ میرا نام عبدالغنی تھا لیکن مجھے سبھی غنیا بُلاتے تھے۔ میں ایک غریب کسان تھا۔ میرے پاس چند کنال زمین تھی جس سے گھر کا گُذارا نہیں چلتا تھا اور مجھے گھر ہستی چلانے کے لئے گھر سے باہر مزدوری کرنے جانا پڑتا۔ میں جنگلوں میں لکڑی چیرنے کا کام کرتا تھا۔ گھر سے میری لمبی لمبی غیر حاضری ہی میری موت کا سبب بنی۔ جس عورت نے تمھیں کھانا پروسا تھا۔ وہ پہلے میری بیوی تھی، جو اِس مرد کے پریم جال میں پھنس کر میرے گھر سے بھاگ گئی اور یہاں اِس مرُدود کے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں جب جنگل چرائی سے گھر واپس آیا تو میری ماں نے مجھے اپنی بیوی کی بے حیائی کے بارے میں بتایا۔

''بیٹا! میری شادی سے پہلے کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں کے ایک دُکاندار دینُو کی بیوی کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی۔ دِینُو کی غیرت نے جوش مارا اور اُس نے دونوں کو گولیوں

سے بھون ڈالا اور خود پولیس تھانے میں پیش ہو گیا۔ میں بھی تمہیں تب تک اپنا دُودھ نہیں بخشوں گی جب تک تم اپنے اجداد کی چادر پر لگا بدنامی کا داغ دھو نہ ڈالو“۔

میری آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ بدلے کی آگ کے شعلے میرے تن بدن میں اُٹھنے لگے۔ میں نے اپنی دیسی بندوق میں بارُود بھرا اور دونوں کو جان سے مارنے کیلئے گھر سے چل پڑا۔ علیے کو میں نے اُسکے گھر میں للکارا اور بندوق کا گھوڑا دبا دیا مگر اِنکی قِسمت اچھی تھی اور میری خراب کیونکہ بندوق چلی ہی نہیں۔ علیا مُجھ پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں گُتھم گُتھا ہو گئے۔ پھر اِس بدذات عورت حمیدہ نے میرے سر پر کلہاڑی سے تین چار وار کئے اور میں خُون میں لت پت زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔ اِن دونوں نے میری لاش کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔ علیے نے پہلے میرے بازو کاٹے۔ پھر میرا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔ میرے چہرے کو مسخ کر دیا تاکہ میری شناخت مِٹ سکے۔ پھر میری ٹانگوں کے ٹکڑے کئے۔ میرے بازو ”چھپڑی والے تالاب“ میں پھینک دیئے۔ ٹانگیں اور جسم کے دیگر اجزا جنگل میں ایک دیودار کے درخت کے پاس گھڑا کھود کر اُس میں دبا دیئے۔ اِس بات کو دس مہینے گذر چکے ہیں۔ میری بوڑھی ماں بہت روئی۔ اُس نے حاکموں کے آگے داد فریاد کی لیکن ثبوت نہ مِلنے کے کارن علیے اور حمیدہ کا کُچھ نہیں بگڑا۔ میری رُوح بھٹک رہی ہے۔ میری رُوح بے چین ہے۔ میں بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟“۔

”پر تُم اپنے قتل کا بدلہ کیسے لے سکتے ہو“۔ میں نے اپنا آپ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری مدد سے“۔ ”وہ کیسے؟“۔

”اگر تم پولیس تھانے میں جا کر میرے قتل کی حقیقت بتاؤ اور جائے وقوع پر لے جاؤ

تو میرے بتائے ہوئے دیگر مقامات پر اُنھیں میرے جِسم کے سارے انگ مِل جائیں گے۔ پھر قاتلوں پر مقدمہ چلے گا۔ سارے ثبوتوں کی بُنیاد پر اِن دونوں ظالم خبیثوں کو سزا ملے گی اور میری رُوح کو سکُون۔ بتاؤ، کیا تم میرا یہ کام کروگے؟ جُرم ثابت کرنے اور حق وانصاف کو زندہ رکھنے کے لئے میرا ساتھ دوگے؟۔ اِن قاتلوں کو قانون کے شکنجے میں جکڑوگے؟۔ وہ بڑی بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں بولا۔

''ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہارے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے تک لے جاؤں گا اور تمہیں انصاف دِلاؤں گا۔ میں ضرور اپنا وعدہ پورا کروں گا''۔

میری بات سُن کر وہ سایہ غائب ہوگیا۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح جب میں اُٹھا تو سورج کی کرنیں مجھے نہلا رہی تھیں۔ رات کا حادثہ ایک خواب بن کر میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ میں وہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اُنہوں نے مجھے نہاری کئے بغیر جانے نہیں دیا۔ دیسی گھی میں گُندھی مکئی کی روٹی کی چُوری کے ساتھ نمکین چائے پینے کے بعد میں وہاں سے چل پڑا اور دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد لاٹی پہنچ گیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں ''تتے پانی'' کی طرف نِکل گیا اور لوہے کے اُس پہاڑ کو دیکھتا رہا جہاں سے نِکلنے والے پانی میں لوہے کا ذائقہ ملتا ہے۔ میرا دِل وہاں نہیں لگا۔ ایک عجیب سی بے قراری مجھ پر سوار تھی۔ اِس لئے میں واپس آگیا۔

''باپُو! کیا بندھول میں کوئی عبدالغنی یا غنیئے نام کا آدمی رہتا ہے؟'' میں نے اپنے سُسر سے پوچھا ــــــ ''ہاں رہتا ہے لیکن اُسے گھر سے غائب ہوئے تقریباً دس مہینے ہوگئے ہیں۔''

''کیا اُس کو کِسی نے قتل کردیا ہے؟''۔

''بیٹا! ہمیں نہیں معلوم، لیکن غنیے کی ماں کا کہنا ہے کہ اُسے پنگارا والے علیے نے مار ڈالا ہے ۔اُس نے بہت شور مچایا۔روتی پیٹتی رہی۔بین کرتی رہی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے قتل کا الزام علیے پر لگاتی رہی۔پولیس نے علیے کو گرفتار کیا تھا لیکن ثبوت نہ ہونے کی صورت میں اُسے چھوڑ دیا گیا تھا۔'' ___ میرے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔کل رات کا حادثہ ایک حقیقت بن کر میرے پیش گاہ تھا___ میں نے اپنی پتنی کو اپنے سالے کے ہمراہ اُدھمپور بھیج دیا اور خود ایک نئے سفر پر چل پڑا۔پورے دِن کی مسافت کے بعد میں پولیس تھانہ بسنت گڈھ پہنچا تھا۔

''آج سے تقریباً دس ماہ پہلے موضع پنگارا میں ایک قتل ہوا تھا۔مقتول کا نام عبدالغنی عُرف غنیا تھا اور قاتلوں کا نام علیہ اور حمیدہ ہے ۔میں اِس قتل کا گواہ ہوں ۔ میں قاتلوں کو جانتا اور پہچانتا ہوں اور مقتول کی لاش کے اجزا کی برآمدگی میں آپکی مدد کر سکتا ہوں۔''

پولیس نے میرا بیان قلمبند کیا۔ایک سب انسپکٹر اور پانچ سپاہی میرے ساتھ بھیجے۔میری نشاندہی پر پولیس نے غنیے کی لاش کے باقیات یعنی بازو اور ٹانگوں کی ہڈیاں اور سر کی کھوپڑی، برآمد کر لئے۔علیے اور حمیدہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

قاری اب سمجھیں گے کہ مجرموں پر مقدمہ چلے گا۔جج اُنھیں عُمر قید یا پھانسی کی سزا سُنائے گا،اور یوں اِس واردات کی کہانی اختتام پذیر ہو جائے گی۔لیکن ایسا کُچھ نہیں ہوا۔اِس قصّے کا انجام یوں روائتی ڈھنگ سے نہیں ہوا بلکہ اِس واردات نے ایک نیا موڑ لے لیا___ غنیے کی لاش کے حِصوں کی برآمدگی اور میری گواہی کی بُنیاد پر علیے اور حمیدہ پر مقدمہ چلا، بلکہ دو سال تک میں مقدمے کی پیروی کرتا رہا۔عدالت میں قتل کے سارے ثبوت پیش کئے گئے۔میں نے عدالت میں علیے کے گھر میں پیش آیا اُس رات کا واقع بھی بیان کیا،لیکن

عدالت کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ جج صاحب اُس بات چیت کا ثبوت مانگنے لگے جو غنیے کی پرچھائیں اور میرے درمیان ہوئی تھی اور جس کی بُنیاد پر اُسکی لاش برآمد کی گئی تھی ___ لیکن میں اُس گفتگو کا ثبوت کہاں سے لاتا۔ اُلٹا قانون کے محافظ مُجھے ہی پھنسانے لگے۔ پرماتما کا شُکر ہے کہ لاٹی آنے سے دو دِن پہلے تک میری حاضری دفتر میں درج تھی۔ اِس کے علاوہ سارے گاؤں والوں نے میرے حق میں گواہی دی تھی۔ اِس بیچ جج اور پولیس کا رویہ میرے ساتھ نامناسب رہا۔ آخر جج صاحب نے فیصلہ سُنا دیا۔

''ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق یہ سچ ہے کہ اِس کیس میں کھوپڑی، ہڈیاں اور دیگر باقیات ایک انسان کے ہیں لیکن پولیس کے چالان اور گواہوں کے بیانات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ انسانی اجزا عبدالغنی عرف غنیٰہ ولد عبدالکریم نائیک ساکنہ بندھول، تحصیل رام نگر، کے ہیں۔ جِسے شاید کسی وحشی جنگلی جانور نے چِیر پھاڑ دیا ہو۔ اِس کیس میں کوئی چشم دید گواہ بھی پیش نہیں ہوا جو یہ ثابت کرتا کہ غنیے کا قتل علیے اور حمیدہ نے کیا ہے۔ لہذا عدالت علیے اور حمیدہ کو باعزت بری کرتی ہے۔''

اب ایک مُدت ہوگئی ہے مجھے لاٹی گئے ہوئے۔ میری پتنی مجھے لاٹی جانے کے لئے اکثر کہتی رہتی ہے لیکن میں تو اُدھمپور سے ہی اپنا تبادلہ کروانے کی سوچ رہا ہوں۔ آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ کیوں۔

●

اپنا دیش مہان

بزرگ کہا کرتے تھے کہ لوگوں سے چھپائیں چاہے اپنا گُڑ کھائیں، مگر آج اِس لرزہ خیز مہنگائی کے دوَر میں گُڑ کھانا تو دُور کی بات ہے، ستّو کھانا بھی محال ہے۔آج یہ ضرب المثل بھی دم توڑ چکی ہے کہ ''شریکوں میں رہیں تو اندر روئیں، باہر ہنسیں'' کیونکہ لوگ گھروں کے اندر بھی رو رہے ہیں اور باہر بھی۔ ہنسنے ہنسانے والی باتیں تو کب کی ختم ہو چکی ہیں۔آج مہنگائی نے سب کو کنگال کر دیا ہے۔ جتنا دُکھی، جوگی دُکھی، روگی دُکھی، غرض سب دُکھی ہیں ۔قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہر چیز سوگنا مہنگی بِک رہی ہے۔اب تو چیزوں کا بھاؤ پوچھتے بھی ڈر لگتا ہے۔زندگی وقت سے پہلے بوڑھی ہوگئی ہے۔عمر کی کمر ٹیڑھی ہوتی جارہی ہے۔آمدن تو شبنم چاٹنے لائق بھی نہیں ہے۔اوپر سے نوٹ بندی، بازار بندی، جی، ایس، ٹی اور بدامنی کا قہر نازل ہوا ہے۔ بنکوں اور اے، ٹی، ایم کے آگے لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ٹیکسوں میں اُلجھے جیون میں روزمرہ کی ضرورتیں پوری کرنا بیل سے دُودھ نکالنے جیسا ہو گیا ہے۔گھروں کے چُولہے ٹھنڈے پڑے ہیں۔سرکار کی پالیسی غریب کی آنکھوں سے سُرمہ تک نکالنا ہے۔کالے دھنوان اب سفید ہو گئے ہیں۔اُنکے لئے اب کوئی خطرہ نہیں۔کروڑوں، اربوں کے قرضدار سرکار کی مِلی بھگت سے قرض معاف کرار ہے ہیں یا پھر بدیشوں کو بھاگ رہے ہیں اور کسان معمولی قرضوں کیلئے پھانسی کو چُوم رہے ہیں ۔غریب مسکین انتخابی منشوروں کے ذریعے ٹھگے جاتے ہیں۔لوگوں کے لئے بھُوک لعنت اور قرض قیامت ہو گیا ہے۔روپیے کی قیمت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں رہی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ کورونا کی مہاماری اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے مفلسی، مایوسی اور بے بسی

نے ہر طرف دہشت مچائی ہوئی ہے۔عوام کو اِس پُر آشوب ماحول سے باہر نکالنے کیلئے سرکار کے پاس کوئی ٹھوس منصوبہ نہیں ہے۔کیونکہ سیاست جگاڑ و کم اور بگاڑ وزیادہ ہوگئی ہے۔لیڈر ایک دوسرے کو نیچا دِکھانے کیلئے نت نئ ترکیبیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔اُن کے لئے تو زندگی کی کوکھ بے شک بنجر رہے لیکن اُن کا حلوہ مانڈا چلتا رہے۔حکومت اعداد و شمار کے چکروں میں اُلجھی ہوئی ہے اور عوام کو بیوقوف بناتی رہتی ہے۔غریب عوام کو گھر کی ضرورتیں مرنے نہیں دیتیں اور مالیٰ پریشانیاں جینے نہیں دیتیں۔دُکھوں اور مُصیبتوں نے ہڑ بونگ مچائی ہوئی ہے۔خوشیاں تو ہمارے پاس سے گذرتے بھی ڈرتی ہیں۔ذمے داریاں رُسوائیوں تلے دب چکی ہیں۔چاروں طرف اندھیرے کا ایک سمندر ہے۔لوگ چیخ و پُکار کر رہے ہیں لیکن سیاست کی بستی کے بن مانس جھوٹ تماشے کرتے رہتے ہیں۔کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ سیاست میں حق وصداقت اور شرمندگی کوئی معنی نہیں رکھتے۔قوم کے اِن رہنماؤں کو آنکھیں پھیرنے میں دیر نہیں لگتی۔مُفلس ونادار چولہے کی راکھ کُریدتے رہتے ہیں کیونکہ سودا سلف خریدنے کیلئے اُنکی جیبیں خالی ہیں۔اُنھیں روزی کمانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔خالی برتن ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں۔اب وہ آپس میں ٹکرانے کا نام بھی نہیں لیتے۔لوگوں کا جیون اندھیری سُرنگ میں پھسا ہوا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔وہ چاہے جتنی محنت کریں۔چاہے جتنا پسینہ بہائیں، بدحالی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ابنِ عربی نے فرمایا ہے کہ دوزخ کا عذاب جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہوتا ہے لیکن ہمارے لوگ تو دونوں عذاب برداشت کر رہے ہیں۔سرکاریں پرتھوی، اگنی، آکاش اور برہموس جیسے جابر میزائلوں اور ایٹمی ہتھیاروں پر کھربوں ڈالر خرچ کر رہی ہیں۔زمین، آسمان اور پاتال پر قبضہ کرنے کیلئے لڑاکو جہاز، سمندری آبدوزیں اور جہاز، ٹینک اور توپیں خریدنے کیلئے بڑی طاقتوں کو قومی

خزانوں کا نذرانہ پیش کر رہی ہیں۔ اِس بیوپار کے لئے لیڈر، سادھو، سنت و چولیوں کا کام کرتے ہیں اور ملک میں بڑے بڑے مندر، آشرم بناتے ہیں۔ اُن میں سے نکلنے والا اربوں روپیہ اور ہزاروں ٹن سونا اِن سادھو سنتوں کی عیاشیوں کی حقیقت بیان کرتا ہے ۔پڑھی لکھی خلقت اُن پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتی ہے ۔سیدھی سادی جنتا پل پل مرنے کے لئے اُن کا آشیرواد لیتی ہے۔غریب تو مٹی کے کھلونے ہوتے ہیں جن کی اوقات بارش کی دو بوندیں سہنے کی بھی نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ سخت جان اور من موجی اِیشور کا شکرادا کرتے رہتے ہیں۔سرکار نے جھگی ،جھونپڑیوں،سڑکوں کی پٹریوں،مندر،مسجد اور درگاہوں کے تھڑوں کی گردوریاں غریبوں کے نام لگائی ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ کوئی چھت ہے،نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا،نہ سونے کیلئے بستر، نہ بیت الخلا ،نہ پانی نہ بجلی اور ہر طرف زندگی کی سرانڈ ۔بے کفن لاشوں کو قبریں نصیب نہیں ہوتیں اور ارتھیاں شمشانوں کو ترستی ہیں ۔پھر بھی ہم لوگ اِس مکروفریب اور وحشت زدہ ماحول میں خوش ہیں ۔اپنے لیڈروں کے لئے کٹ مرنے کو تیار ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ''ہمارا دیش مہان، اِس کی اونچی شان''۔

●

جاگتے ضمیر کی آواز

میں اپنی پیڑیں بیچنے بازار میں آیا تھا۔ میں بہت دیر تک آوازیں لگاتا رہا پر کوئی گاہک نہیں مِلا۔ میں اُداس ہو گیا۔ ____ بازار کی نکڑ میں مجھے ایک معصوم وکم سن بچہ ملا جو اپنی معصومیت میں آرزوئیں خریدنے آیا تھا مگر اُسے بھی اپنی مرادوں ایسی کوئی چیز نہیں مِلی۔ پھر ہم دونوں بازار کے چوراہے پر کھڑے ہو گئے اور آتی جاتی لاشوں کی بھیڑ کو دیکھتے رہے جو دُنیاوی چیزوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے افراتفری میں ہانپتی، بھاگتی جارہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر ہم نے اپنے جاگتے ضمیر کی آواز سُنی اور پیڑوں اور خواہشوں کے ٹوکرے دُور پھینک دیئے اور دونوں کھُل کر ہنسنے لگے اور پھر واپس اپنے اپنے حُجروں کی طرف لوٹ آئے۔

●

رحیمن دھاگہ پریم کا

میرے پوتے رگھونندن کے دماغ میں کڑواہٹ کا زنگ آلود لوہا بھرا ہوا ہے۔ وہ اِس لوہے کو آگ کی بھٹی میں تپاتا رہتا ہے۔ اِسے ٹھنڈا ہونے نہیں دیتا۔ وہ اپنی بدکلامی چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ اُس نے میرے سارے گھر کو زہریلے شبدوں کا کوڑادان بنا دیا ہے۔ اعلیٰ سائنسی تعلیم اور دھارمک گیان حاصل کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے دِل ودماغ کو کھلی ہوا میں سانس لینے ہی نہیں دیتا۔ وہ لفظوں کی دہشت گردی سے میرا من میلا کرتا رہتا ہے اور ہر وقت ہندو، مسلم دشمنی کا راگ الاپتا رہتا ہے، اور امن وآشتی کی جڑیں کاٹنا چاہتا ہے۔ دماغ میں بھرے مذہبی زہر کی وجہ سے اُسکی زبان ہمیشہ کڑوی رہتی ہے۔ رگھونندن کے ہم خیال دوست بھی جگہ جگہ نفرت کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ یوں تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مانے جاتے ہیں لیکن اُنکی ڈگریوں میں پیار اور محبت کی خوشبو نہیں ملتی۔ انہوں نے ہماری دھرتی کو بدصورت بنا دیا ہے۔ رگھونندن اور اُسکے دوست لوگوں کو لہو رنگے کپڑے پہنانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کبھی گئو ماس، کبھی پیار جہاد، کبھی زمین جہاد اور کبھی کورونا جہاد کے نام پر لوگوں کی سانسیں اُکھاڑ دیتے ہیں۔ میں جتنا چاہوں اُسکو ڈانٹوں یا اُسکی جھاڑ پھونک کروں، اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جلتی پر تیل کا کام کرتا رہتا ہے تاکہ آگ کے شعلے بڑھکیں اور خلقت کو اُجاڑیں۔ یہ نوجوان نام نہاد دھرم گوروؤں اور سیاسی بن مانسوں کے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں جو من گھڑت کہانیاں سُنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اُن کی مُرغی کی تین ٹانگیں ہیں۔ غریب مسکینوں کے گھروں کی چھتیں اُکھاڑ کر یہ اپنے غرور کی پگڑی کا شملہ اونچا کرتے رہتے ہیں۔ میں

نے لاکھ سمجھایا کہ یہ نام نہاد خبیث رہنما اپنے حیوانی نظریے کا اظہار کھُلم کھُلا کر کے طبقاتی نفرت پھیلاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اِس سوہنی دھرتی پر کوئی دوسرا بھی دانہ دُنکا چُگ سکے لیکن رگھونندن کے کُند ذہن میں میری باتیں داخل ہی نہیں ہوتیں۔ وہ دھرم کو بدنام کرنے والے طبقہ سے جُڑا ہوا ہے جو صرف خود کو پوری قوم مانتا ہے اور دوسرے دھرموں سے وابستہ لوگوں کو دیش غدار، آتنک وادی اور جہادی۔ ''دیش کے غداروں کو، گولی مارو سالوں کو'' جیسے نعرے لگوا کر یہ اُنھیں ڈرانا اور بھگانا چاہتے ہیں۔ اِسی وجہ سے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں ــــــ میں نے کئی بار رگھونندن سے کہا کہ باہمی رِشتوں کی دیوار کو گرنے سے بچانے کے لئے سُتون کا کام کرے لیکن وہ تو کُدال، پھاوڑا اور ڈنبل بننا چاہتا ہے۔ ــــــ دوسری طرف ہمارے مُلّا مُفتی اور مفتون دینی تبلیغ میں عرشوں کی سیر کراتے ہیں اور باغ بہشت کے میوے کھلاتے ہیں لیکن فرشوں پر رہنے والی سادہ مخلوق کو دوزخ کی آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ ثواب اور عذاب کے بھنور میں گھُمائے رکھتے ہیں۔ باہر نکلنے ہی نہیں دیتے۔ لاکھ کوشش کرلیں لیکن اِن کا قبلہ کبھی سیدھا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ آسمان کو ٹاٹ کے پیوند لگاتے رہتے ہیں۔ سرکاریں بھی چاہتی ہیں کہ موت کی منڈیاں لگی رہیں اور قاتلوں کو مان سمان ملتا رہے۔ سرکاروں کے اِس طریقۂ کار نے دیش کو انگار بنا دیا ہے۔ بندوق اور تلواروں کی کھڑکار نے لوگوں کے رونگٹے کھڑے کردیئے ہیں۔ پورے مُلک میں گھُٹن کا ماحول بن گیا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ شاعر، ادیب، فنکار اور دانشور یا تو گونگے بہرے ہوگئے ہیں یا اُنہوں نے اپنی عقل پر عقیدوں کے طنبو تان لئے ہیں۔ ڈر، خوف نے زبان بند کردی ہے۔ سیاست کی مکاریوں نے کھرے اور کھوٹے کا فرق ہی مٹا دیا ہے۔ میں نے رگھونندن کو یہ باور کرانے کی بہت کوشش کی کہ اِن نام نہاد

مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی دُکانیں بے شک الگ الگ ہیں لیکن سوداسلف ایک جیسا ہوتا ہے ۔لیکن میری باتیں اُس کے پلے نہیں پڑتیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اِن فرقو فسادوں میں لوگ سُولی چڑھتے ہیں ۔وہ بیچارے ماگھ کے پالے میں ٹھٹھرتے ہیں اور جیٹھ کی لُو میں سڑتے ہیں۔ اُنکی چیخیں سُن کر صِدقی اور رحم دِل انسانوں کی آنکھیں بھر آتی ہیں لیکن سرکاروں کے لئے تو ''دیش ماہی کا بسے ،کوئی روئے چاہے ہنسے'' والی بات ہے۔پُرانے دنگوں پر مٹی ڈالو لیکن ابھی حال ہی میں ہمارے دیش کے دِل، دہلی میں دوبارہ سنتالیس چڑھ دوڑا ہے ۔جُونی فسادیوں اور بلوائیوں کے جتھے ایک دوسرے کے ماتھے پھوڑ رہے ہیں ۔کرودھ اور وِوردھ کے تندوروں میں سب رشتے راکھ ہوتے دیکھے جاسکتے ہیں ۔بدلے کی سیاست انسانی لہُو کی دشمن بن گئی ہے ۔نہ سانجھے چُولہے رہے ہیں اور نہ پیار پچولے۔ دھرم کی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر ہمیشہ قہر ڈھایا ہے ۔فسادیوں کی آنکھ کا پانی مر جاتا ہے۔ گھنا فرت انتشار پھیلا دیتی ہے، اور پھر سیاسی روٹیاں سینکنے والے دردر کی ٹھوکریں کھانے والے مسکینوں کی بناوٹی خدمت کرنے لگتے ہیں تا کہ میڈیا پر ڈرامہ دِکھا کر اُنھیں میوہ مِل سکے۔

دنگے بھڑکانے والے ایک گروہ کی قیادت رگھونندن بھی کر رہا تھا۔ دوسرے فرقے کے لوگوں کی اکثریت والے ایک محلے میں مچائی جانے والی تباہی اُس وقت اُلٹی پڑ گئی جب وہاں سے بھی ٹوکے ،چھریاں اور لاٹھیاں لئے ایک ٹولی تیار بیٹھی تھی ۔دونوں طرف سے ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال ہوا۔ کسی قصائی نے رگھونندن کے سر پر ٹوکا دے مارا۔ اُس کا سر پھٹ گیا اور ایک ہاتھ کی پانچوں اُنگلیاں کٹ گئیں ۔اُس کے ساتھی رگھونندن کو فوراً ہسپتال لے گئے۔ اُسکے سر پر پچیس ٹانکے آئے تھے ۔ہاتھ کا آپریشن ہوا۔ پھر مرہم پٹی کے

بعد وہ اُسے گھر چھوڑ گئے۔ اُس کی حالت دیکھ کر ماں نے رو رو کر بُرا حال کیا۔ میں پوتے کے پاس بیٹھا رہا۔ رگھو کو نیند کا انجیکشن دیا گیا تھا تاکہ وہ سو سکے ___ دس بارہ دِن اُس کا علاج چلتا رہا۔ میں فِکروں میں ڈوبا اُس کی شفایابی کی دُعائیں مانگتا رہا ___ پھر حالات پر قابو پانے کیلئے سرکار جاگی۔ امن کمیٹیاں بن گئیں۔ آفت کے مارے بے گھر لوگوں کی پھر آبادکاری کیلئے سچے جھوٹے سپنے دِکھائے جانے لگے۔ رگھونندن کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ وہ مجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ پھر ایک دِن کہنے لگا،

''دادا جی! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ دیش غداروں نے بھی مورچے سنبھالے ہوں گے۔ اِن کی اتنی جّرات کہ یہ ہمارے مقابلے پر آجائیں۔ ضرور ہمارے دشمنوں نے اِنکی مدد کی ہوگی۔''

''رگھو بیٹے! آدمی ایک حد تک ہی ڈرتا ہے۔ جب موت سامنے نظر آرہی ہو تو اُس کا ڈر اور خوف ختم ہو جاتا ہے اور وہ مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے''

''یہ تو ٹھیک ہے دادا جی! لیکن ہم اِن سانپوں کو سر اُٹھانے نہیں دیں گے۔ اِن کے سر کاٹ کر کُتوں کو ڈالیں گے۔'' وہ آنکھیں اونچی کر کے مُجھے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

''نا... تُم مجھے بتاؤ تو سہی کہ اِتنی نفرت کیوں ہے تمہیں اِنکے ساتھ۔ تمہارا کیا بگاڑا ہے اِن لوگوں نے؟''۔

''یہ غلیظ سارے دہشت گرد ہیں۔ غدار اور ملک دُشمن۔ ہم انہیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ اِن کو یہاں سے بھگانا ہے۔ یہ وحشی درندے ملیچھ ہیں''۔ وہ آک چبانے لگا۔

''اوئے غُل غپاڑے! کیوں اُن سیاسی شطرنج بازوں کے مہرے بنے ہو اور اُنکی بولی بول رہے ہو۔ اوئے غلاظت کے کیڑے! اُن ریاکاروں کی وجہ سے ہماری دھرتی پر ہمیشہ راج نیتی اور دھرم کا ہی قبضہ رہا ہے۔ انسانیت کو تو اُن مکاروں نے کبھی سر اُٹھانے ہی نہیں

دیا۔ بیٹا! جو فریبی دغا باز تم جیسوں کو ورغلاتے ہیں وہ محبتوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرنے والے لوگ ہیں۔ اُن کے نیلے، پیلے، کالے، سفید اور سبز رنگوں کے لباس پر نہ جاؤ۔ اُنکی ٹوپیاں، داڑھیاں، تِلک اور محرابیں.... سب سماجی یکجہتی کے تانے بانے کو توڑنے کیلئے ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں کے باغ کو اُجاڑنے کیلئے ہیں۔ اس لئے اُن کا ساتھ چھوڑ دو۔

بیوقوف! آگ سے آگ نہیں بجھتی بلکہ پھیلتی ہے۔ یہ زندگی کے ساگر کو صحرا بنا دیتی ہے۔ سنور گھو! جھوٹ کی چوہدراہٹ زیادہ دیر نہیں رہتی لیکن لوگ اُنکی عیاری کو کیوں بھگتیں۔ اُنکی گندی سیاست لوگ کیوں برداشت کریں۔ اُجاڑ بستیوں کے برباد لوگ اُنکا ظلم کیوں سہیں، اِس لئے اپنے اندر کی کدُورت کو ختم کرو۔ نفرت کی آگ بجھاؤ۔ سچی آوازوں کو قتل نہ کرو۔ اپنے عقیدوں کے خنجروں سے دوسروں کو نہ مارو۔ میری بات پر غور کرو کہ انسان کے گناہ اُسکے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ اُس کے گناہوں کا بھگتان اُسکی نسلیں کرتی ہیں۔ میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم نے بھی تاریخ پڑھی ہے۔ دادے، پڑدادے کی کرنی، پوتروں، پڑپوتروں کو بھرنی پڑتی ہے۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ ایشور نے بندے کو دُنیا میں بھیجتے وقت اُسکو دھرم یا ذاتوں کی پہچان نہیں دی۔ لیکن ہم لوگوں نے اُسے مذہب کے الگ الگ چوکھٹوں میں بانٹ دیا۔ پرم پرمیشور نے یہ سرشٹی اور کائنات ہر جان دار کے لئے بنائی ہے۔ زمین، چاند، سورج، سیارے، پانی، اور ہوا کل عالم کیلئے ہیں۔ کسی خاص مذہب یا فرقے کے لئے نہیں۔ ہمارے سنتوں نے کہا ہے۔

"رام رحیم سب پریم کتھا، پریم ہی سب کی جوُن"

"پردادا جی! ہمارے پُرکھوں نے اِن کے ہاتھوں گہرے زخم کھائے ہیں۔ بے شمار شہادتیں

دی ہیں۔ طاقت کے نشے میں یہ اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھتے تھے اور ہماری انتڑیاں جلاتے تھے"۔

"بس ... بکواس نہ کرو۔ ہمارے اور اِن کے پُرکھے سب ایک ہی تھے، کوئی جُدا نہیں تھے۔ دھرم یا عقیدہ بدلنے سے نسل نہیں بدلتی۔ زمین نہیں بدلتی، چاہے اسے ہزار ٹکڑوں میں بانٹ لو۔

ہم سب کی جنم بھومی ایک ہی ہے۔ تاج اور تخت بے شک پھوٹ ڈالیں اور نفاق پیدا کریں لیکن وقت کی گردش بڑی بلوان ہوتی ہے کیوں کہ وقت اور بخت کبھی ساتھ ساتھ نہیں چلتے ۔ جو کسی کے لئے گڑھا کھودتا ہے اُس کے لئے کھائی تیار ہوتی ہے ۔ اِس لئے تکبر اور رذالت چھوڑ دو۔ ہمارے دیوتے اور دیواستھان لوگوں میں خوشیاں بانٹتے ہیں ۔ سنت، فقیروں کی درگاہیں پیار کی روشنی پھیلاتی ہیں ۔ اس لئے اپنے سمھیاچار اور ثقافت کو برباد نہ کرو۔ جھوٹ کی مالا پھیرنی چھوڑ دو۔ سائیں بُلھے شاہ نے سچ ہی کہا ہے کہ

سچے دھکے کھاتے دیکھے

جھوٹے ساتھ بٹھائے

زمانے کیسے اُلٹے آئے

تم اچھے کرم کر کے دھرم کماؤ اور اِن ریاکاروں کے کہنے میں آ کر اپنے دھرم کو بھرشٹ نہ کرو۔ سن سنتالیس میں بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں کی باتوں میں آ کر ہمارے بڑوں نے بھی یہی کُچھ کیا تھا۔ دھرتی دو پھاڑ کر دی تھی ۔ زندگی سکنجے چڑھا دی تھی ۔ اچھے موسم کے انتظار میں ہم نے ایک مُدت تک بُرے موسموں کو جھیلا ہے لیکن اُس ماحول میں بھی ہر برادری میں ایسے نیک انسانوں کی کمی نہیں تھی جنہوں نے پیڑھی در پیڑھی مشترکہ قدروں

کوٹُوٹنے نہیں دیا۔ وہ اُس وقت بھی سربت کے بھلے کیلئے جھولی پھیلا پھیلا کر دُعائیں مانگتے تھے۔ ہم بھی دُلا بھٹی کی نسل سے ہیں، جس نے ایک جوان بچی کی عزّت بچانے کے جُرم میں سُولی کو چُوما تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ وہ دوشیزہ ہندو تھی یا مسلمان۔ رشتے پالنا اور نبھانا ہمارے اقدار میں شامل ہے۔ ہم ایک دوسرے کی دوستی اور نیک نیتی پر شک نہیں کرتے تھے۔ ہمارے دِلوں کی گولک میں صوفی درویشوں کی پوتھیوں کا بسیرا تھا۔ ہم پیر پُوجن والے لوگ تھے۔ جبھی تو پریم پیار کے مشکیزے سیتے رہتے۔ ملک تقسیم ہونے کی وجہ سے ہم پر دُکھوں کے پہاڑ ٹوٹے لیکن اس کے باوجود ہم نے اپنی ساکھ خراب نہیں ہونے دی۔ رواداری قائم رکھی۔ ہمارا پاس پڑوس محبتی تھا۔ ہم نے بابا نانک کی بانی کو ہمیشہ ستکار دیا جنہوں نے فرمایا تھا

اللہ الکھ، اگم قادر، کرن ہار کریم

سبھ دُنی آون جاون مقام اِک رحیم

تب ہمارے بزرگوں کی جیون صندوقڑی محرومیوں اور ضرورتوں سے بھری پڑی رہتی تھی لیکن پھر بھی ہم نے اپنی ایمانداری اور راست بازی کو بددیانتی کے کاسے میں نہیں ڈالا بلکہ صبر، شُکر اور صِدق سنتوکھ کی مالا جپتے رہتے تھے اور آس اُمید کے گھنگرُو پاؤں میں باندھے، اپنے کرتار کا شکر کرتے رہتے تھے۔ آؤ... میں آج تمہیں اُن دردمند اور پُرخلوص رُوحوں کی بے شمار کہانیوں میں سے ایک کہانی سُناؤں تا کہ تمہارے جیسے عقل کے اندھے انسانیت کے بخیئے نہ اُدھیڑ سکیں اور ہندو مسلمان کی بے سُری ٹُھمری گانے سے پرہیز کریں۔ تم اور تمہاری سوچ کے دیگر افرادِ دِل کی زمین میں سچ کے بیج بوئیں، محبت کی پنیری لگائیں اور امن و آشتی کی فصل کاٹیں تا کہ ہمارا ملک اور ہمارے لوگ خوشحال رہیں۔

یہ سن پینسٹھ کی جنگ کے دو برس بعد کی بات ہے۔ میں تب پرائمری سکول ''سیلاں خُرد''، تحصیل نواں شہر میں ماسٹر لگا ہوا تھا جو ہمارے گاؤں ''بیڑے'' سے کوئی دو کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ میری شادی ہو چکی تھی اور تمہارے باپ کو چاچا کالی داس بھٹی نے سکول میں داخل کرایا تھا۔ میرے باپو رام لال بھٹی 1965ء کی لڑائی سے کوئی چھ سات مہینے پہلے اکال چلانا کر گئے تھے۔ مکان، زمین، مال مویشی اور کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری کالی چاچے کے ہاتھ تھی۔ ایک دِن ہمارا ہمسایہ کیسر سنگھ بھٹی کسی پاکستانی کو لیکر ہمارے گھر آیا اور کہنے لگا۔

''مغربی پنجاب کی تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں ''کُرسیاں'' سے آپکا مہمان آیا ہے۔ چاچے رامے کا پتہ پوچھتا پوچھتا ہمارے گھر آ گیا تھا۔ میں نے احتراماً چارپائی پر بٹھایا۔ خیر، خیریت پوچھی، چائے پانی کی سیوا کی اور اب اِسے لیکر تمہارے گھر آیا ہوں۔ پاکستانی مہمان چاچے رامے سے ملنے آیا ہے___ یار! میں حیرت زدہ ہُوا جب اِس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ امر سنگھ بھٹی کا گھر ہے اور کیا تم اُسکے بیٹے ہو۔ جب میں نے ہاں میں گردن ہلائی تو کہنے لگا___ ''تمہاری بیٹھک میں ایک بڑا پلنگ بچھا ہوتا تھا، وہ اب وہاں ہے؟''۔ جب میں کہا کہ ہاں وہیں بچھا ہے تو کہنے لگا کہ اُسکے رنگ دار پاوے اُس نے امرُو کو دیئے تھے۔''__ پھر اُس نے مہمان کی اٹیچی میرے ہاتھ میں دی اور خود چلا گیا۔ میں نے اُس شخص سے اُسکا نام پوچھا تو وہ بتانے لگا۔

''میرا نام فتح دین بھٹی ہے۔ ''بٹیرا'' ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ میرے والد مہر دین بھٹی اِس علاقے کے ایک مشہور حکیم تھے۔ میں یہاں صرف رام لال بھٹی سے ملنے آیا ہوں۔ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں۔'' پھر اُس نے میرا نام پوچھا۔

''میرا نام برج لال بھٹی ہے اور میں آپ کے دوست کا بیٹا ہوں ۔ باپُو تقریباً تین سال پہلے ایشور کو پیارے ہو گئے تھے ۔ میرا چاچا کالی داس بھٹی کھیت کمانے گیا ہے ۔ دوپہر چڑھ آئی ہے ۔ بس وہ اب آنے ہی والا ہوگا ۔ اُسے آنے دیں ، پھر اکٹھے کھانا کھائیں گے ۔

کچھ دیر بعد کالی چاچا آ گیا تو میں نے صحن میں ہی اُسے پاکستانی مہمان کے بارے میں بتا دیا ۔ جب وہ بیٹھک میں داخل ہوا تو کالی چاچا نے اُسے بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا اور خوش ہو کر کہنے لگا ۔

''واہ بھئی واہ ! میرا بڑا بھائی فتح دین بھٹی آیا ہے ۔ میں بھی حیران تھا کہ بھلا پاکستان سے ہمیں کون ملنے آ گیا ہے'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ۔

''اوئے برجو ! یہ کون سا پاکستانی ہے ، یہ تو یہاں کا موروثی ہے ۔ یہی اِسکی بھی جنم بھومی ہے ۔ ہماری ہی ذات برادری کا ہے ۔ اسکا باپو تاتا مہر دین ہمارے سات آٹھ دیہات کا واحد حکیم تھا جو لوگوں کی خدمت کرتا تھا ۔ اِن کی پُشتینی کوٹھی بلدیو سنگھ سندھو کو الاٹ ہوئی تھی اور چالیس ایکڑ زرعی اراضی سرکار نے وریام سنگھ ِگل ، اوتار سنگھ سِدھو اور بلکار سنگھ کو اُنکے کلیم کے بدلے الاٹ کی تھی ۔''

پھر ہم نے اکٹھے دوپہر کا کھانا کھایا ۔ بعد ازاں دونوں آنگن میں بچھی چار پائیوں پر بیٹھ گئے ۔ میں نے حُقہ تازہ کیا ۔ وہ حُقہ پینے لگے اور بٹوارے کے قصے دوہرانے لگے ۔ چاچے فتح دین کی آمد کا جب گاؤں والوں کو پتہ چلا تو وہ اُسے ملنے کیلئے آئے ۔ وہ میرے باپُو ، کالی چاچے اور اپنے بچپن اور جوانی کی شرارتوں اور خرمستیوں کی کہانیاں سُناتا رہا اور پُرانی یادوں کو تازہ کرتا رہا ۔ ہم سب اُنکی باتوں سے لُطف اندوز ہوتے رہے ۔ یوں دیر رات تک رونق میلہ لگا رہا ۔

دوسرے دِن جب دونوں صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو چاچے فتح دین نے بات چھیڑی۔

''کالی یار! شاید تمہیں معلوم ہو کہ سن سنتالیس کی افراتفری کے دوران میں نے بھائی رامے کو اپنی ایک مٹکی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ میری امانت کو سنبھال کر رکھے۔ جب مارا ماری تھم جائے گی اور امن قائم ہو جائے گا تو میں اپنی امانت واپس لے جاؤں گا۔''

''ہاں ہاں! مجھے معلوم ہے۔ بھائی جی نے مرنے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری امانت اُنہوں نے صحن میں لگے بیری کے درخت کے پاس زمین میں دبا کر رکھی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے مُجھ سے گیتا پر حلف لیا تھا کہ میں ہرگز امانت میں خیانت نہ کروں اور جب تم آؤ تو مٹکی تمہارے حوالے کر دوں۔ اب تم آ گئے ہو، اسلئے یہ کُدال پکڑو اور بیری کے پاس دبی ہوئی اپنی مٹکی نکال لو۔ بھائی جی کے بتانے کے بعد میں تو کبھی اُس طرف گیا ہی نہیں۔''

چاچے فتح دین نے کُدال مُجھے دی اور زمین کھودنے کے لئے کہا۔ اڑھائی، تین فٹ گہری کھُدائی کے بعد کھدر کے کپڑے میں لپٹی اور مومی لفافے سے ڈھکی ہوئی مٹکی نظر آ گئی۔ میں نے مٹکی چاچے فتح دین کے ہاتھ میں دی۔ وہ بڑا خوش ہوا اور باپو کو دُعائیں دینے لگا۔ پھر اُس نے کالی چاچے سے کہا کہ اگلے دِن وہ گاؤں کی پنچایت بُلائے۔ وہ پنچایت کے روبرُو کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔''

دوسرے دِن پنچایت کے سبھی ممبران اور سرپنچ ہمارے آنگن میں جمع ہوئے۔ گاؤں سے بھی کئی لوگ حاضر تھے۔ چاچا فتح دین اُن سے مخاطب ہوا۔

''آپکو اب تک معلوم ہو گیا ہو گا یا بھائی کالی نے بتایا ہو گا کہ ہم موضع ''پیڑا'' کے پُشتینی باشندے ہیں۔ سن سنتالیس میں کُچھ سیانے کوووں نے نجاست کھائی اور دھرم کی راج نیتی

نے ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کردیا۔ذات برادری اور ہمسایہ داری کے باوجود ہم سب نے ہندواور مسلمان ہونے کا خمیازہ بھگتا۔زندگی گلبلا گئی۔ہوش سنبھالنے میں خاصا وقت لگ گیا۔مفاد پرست حاکموں نے زندگی کو زہر بنادیا تھا۔جیون کو دوبارہ پٹری پرلانے کے لئے ہم نے سخت محنت کی اور ٹوٹی پھوٹی حیاتی کو جوڑتے رہے۔زخموں پر مرہم لگاتے رہے۔تب کہیں جا کر پھر اُٹھنے کے قابل ہوئے مگر اُن ڈری سہمی راتوں میں بھی کئی سچے اور پُر خلوص لوگ تھے جنہوں نے انسانیت کے چراغ جلائے رکھے۔لوگوں کی جان بچائی۔عورتوں کی عزّت کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔اُن نیک بندوں میں میرا یار رام لال بھٹی بھی تھا۔گاؤں چھوڑنے سے پہلے میں نے اُسے اپنی امانت سنبھالنے کے لئے دی تھی۔آج بھائی کالی نے میری امانت مجھے واپس کردی ہے۔'' چاچے فتح دین نے سونے کی مٹکی سرپنچ کو دیتے ہوئے کہا۔''سرپنچ جی! اِس مٹکی میں سونے کی سیر سیر وزنی دس اینٹیں ہیں، کُچھ زیورات ہیں اور چاندی کے پانچ ہزار روپے ہیں۔میں یہ سارا سونا چاندی گاؤں کی پنچایت کو دان کرنا چاہتا ہوں، مگر میری ایک شرط ہے۔''۔سرپنچ نے پوچھا،

''بھٹی صاحب! آپ حُکم کریں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ اِس سونے چاندی کو فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو، اُس سے گاؤں میں میرے والد کے نام پر ایک ہسپتال بنایا جائے۔''

پنچایت نے فتح دین کی بات کو تسلیم کیا اور ''حکیم مہر دین یادگار ہسپتال'' بنانے کی قرارداد پاس کی۔دوتین دِن مزید گاؤں میں گذارنے کے بعد فتح دین بھٹی واپس پاکستان چلا گیا۔اُسکو واہگہ بارڈر تک چھوڑنے کیلئے پنچایت کا سرپنچ، سیکریٹری اور چاچا کالی گئے تھے۔

میں سرکاری نوکری سے فارغ ہونے کے بعد تمہارے باپ کے پاس دہلی آ گیا لیکن آج

بھی ''پیڑے'' گاؤں میں ''حکیم مہر دین یادگار ہسپتال'' چل رہا ہے اور چاچے فتح دین کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔

تم کو یہ کہانی سُنانے کا مطلب یہ سمجھانا ہے کہ سخاوت کرنے والے دھرم یا ذات نہیں دیکھتے ۔یہ سرشٹی تمام جان داروں کیلئے ایشور نے سجائی ہے ۔اس میں سب کو جینے کا حق ہے ۔مذہب کے نام پر اپنے دیش میں فساد برپا نہ کرو۔ کیونکہ شاعر کہتا ہے

؎مذہب کا زہر گھول کر جام خُلوص میں

کتنے ہی رِشتے آپسی ہم نے جُدا کیے

اس لیے بیٹا اپنی مختصر زندگی میں ایک دوسرے کے کام آؤ۔ایک دوسرے کے دُکھ درد بانٹو اور امن کے گیت گاؤ۔''۔

میری باتیں سُن کر رگھونندن سوچ میں پڑ گیا اور پھر آکاش کی طرف دیکھنے لگا۔

●

خوف ناک

راج نیتی کی بستی کے اکثر لوگ بے رحم، بدلحاظ، مفاد پرست اور گھٹیا سوچ کے ہوتے ہیں ۔یہ عوام کو بیوقوف بنانے کیلئے کمینی حرکتیں اور مداریوں والے تماشے کرتے رہتے ہیں کیونکہ سیاست کے سینے میں دِل نہیں ہوتا۔ضمیر مرا ہوااور آنکھیں بے حیا ہوتی ہیں۔اسی لئے میں نے اِن خوف ناک لوگوں سے دُور، انحد کی گود میں پناہ لی ہوئی ہے۔

●

حرصِ سمندر

میں نے دھان اور گندم کے خالی کوٹھار والے کچے گھر سے اُس بڑی حویلی تک پہونچنے کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا تھا۔ پھر بھی میرا شِکم سیر نہیں ہوا۔ مجھے اطمینان نصیب نہیں ہوا ، کیونکہ صبر نام کی بُوٹی میں نے اپنے اندر کبھی اُگنے ہی نہیں دی۔ لوبھی جیون کو کبھی حق اور سچ کا رس پینے نہیں دیا۔ میں نے کوئی ربی سنگت نہیں رکھی اور نہ ہی انحد کی تسبیح پھیری۔ میں نے فقر کے ساتھ بھی کبھی ناطہ نہیں جوڑا اور نیکی جیسے لفظ کو اپنے دِل و دِماغ سے ،جُوتے پر پڑی گرد کی طرح جھاڑ دیا ، اور اپنے من مندر کے اندر موہ، مایا اور اہنکار کی مورتیاں رکھتا رہا اور کرم کانڈ کرتا رہا۔ میں نے ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے ضمیر کو مکر وفریب کی کھُٹی میں بند کر دیا۔ کاغذی بٹیر میرے اطراف چکر لگاتے رہتے اور میں اُنکی چُونچ میں چوگ ڈالتا رہتا۔ وہ میری جیب میں پڑی حرص ولالچ کی گیدڑ سنگھی سُونگھتے رہتے_____

میں پڑھا لکھا بھی تھا اور گھاگ تجربہ کار بھی ۔ میں نے شبد سادھنا کی تھی۔ شبد میرے مُرشد تھے۔ شبد میرے ہتھیار تھے، اور شبد ہی میرا اسنسار تھے۔ میں نے اپنی فنکارانہ چرب زبانی سے لفظوں کو رسیلا اور رنگیلا بنانے کا گُر سیکھ لیا تھا اور دھیلی دے کر حویلی لکھوانے کا ڈھنگ بھی۔

میں اب مُٹھیوں سے دولت کا دریا پینے لگا تھا۔ میرا پیٹ بھر چُکا تھا لیکن آنکھوں کی بھُوک مِٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بڑی بڑی حویلیاں اور کوٹھیاں دیکھ دیکھ کر میں تنگ آ چُکا تھا اور ایک ایسی بُلند وبالا عمارت دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا جو آسمان کو چھو سکے۔

پھر میں نے ایک ایسی عظیم الشان عمارت بنائی جو بُرج خلیفہ سے بھی چند ہاتھ اُونچی تھی
۔اُس عمارت کو دُنیا کا دسواں عجوبہ مان لیا گیا تھا۔لوگ میری تعریفوں کے پُل باندھ رہے
تھے۔اب میں بہت خوش تھا۔میرے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔میں تکبّر کے اُڑن
کھٹولے پر اُڑتا اُڑتا اُس عظیم عمارت کی چھت پر جا بیٹھا اور کائنات کو دیکھنے لگا جو مجھے کہیں
دِکھائی نہ دی۔صرف میں تھا، دوسرا کوئی نہ تھا۔چارسُو ویرانی تھی۔چوگردا خالی تھا۔زمین
سے میرا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔میں نے زمین پر اُترنے کی لاکھ کوشش کی لیکن مجھے کوئی راستہ
نہیں ملا۔آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارت کی چھت پر میں اکیلا رہ گیا۔

میں اپنے ہی عملوں کے پھندے میں پھنس گیا۔آسمان کو چھوتی عمارت میرے لئے کال
کوٹھری بن گئی۔۔۔۔ایک اندھیری سُرنگ۔۔۔۔ایک قید خانہ۔۔۔۔اپنا بنایا ہوا۔۔۔۔

اور میں ایک قیدی۔میری ریاکاری اور ہوس کا جال صداقت نے کُتر دیا۔میرے
اندر اُگا غرور کا پہاڑ جوالا مُکھی کی طرح پھٹ گیا اور کھُپٹی میں بند پڑا میرا مردہ ضمیر باہر نکل
آیا۔میں پستی اور سیاہ بختی کی حدوں سے باہر نکلنے کا طریقہ ڈھونڈنے لگا لیکن میرے کھنڈر
شریر کی قبر میں پڑا میرا مردہ ضمیر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا جسے کیڑیاں چاٹ رہی تھیں۔

مداوا

میں للّہ ماں اور نُند رِشی کا مُرید اکثر خوابوں میں اُن سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ وہ اپنی جنّتِ بے نظیر کو دوزخ کے شعلوں میں جلتے دیکھ کر بہت دُکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے مذاہب کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی عمر بھر کوشش کی۔ وہ کامیاب بھی ہوئے۔ جبھی تو عوام نے اُنھیں عزّت واحترام بخشا۔ سچے من سے اپنا ولی اور اوتار مانا کیونکہ اُنہوں نے مذہب اور ذات پات کے نام پر انسان کو بانٹنا کُفر سمجھا تھا۔ وہ حیران ہیں کہ لوگ سیدھے راستے پر چلتے چلتے کیسے اُلٹی ڈگر پر چل پڑے۔ وہ پریشان ہیں کہ اُنکے رِشی صدیوں سے رِشتوں کو جوڑنے کا کام کرتے رہے لیکن یہ دھرموں کے لٹھ بردار بندر بانٹ کر کے دھرم کے نئے رُوپ اور سرُوپ سامنے لا رہے ہیں۔ اِن بنیاد پرستوں نے یہاں انسانیت کو سُولی پر ٹانک دیا ہے۔ انہوں نے ہر طرف نفرت کے کانٹے بچھا دیئے ہیں۔ اِنکی وجہ سے سانجھ پیار کے گھر بُخار سے تپنے لگے ہیں اور خلقت منافرت کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے

مگر وہ اِس بات سے خوش بھی ہیں کہ برسوں تک جھگیوں اور خیمہ بستیوں میں رہنے کے باوجود بھی دودھ اور لہو کے رِشتے نیز ماضی بعید اور ماضی قریب میں رہی محبت اور دوستی کی قُربتیں ابھی بھی قائم ہیں۔ کینہ پروری میں مُبتلا اِنکے نام نہاد نمائندے حسد اور بُغض کی بُخاری جلائے رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے ذاتی مقاصد کیلئے تعلقات میں پڑی گُنجلک کھولنے ہی نہیں دیتے۔ دوسری جانب ڈر، خوف، بے بسی اور اُداسی نے جن لوگوں کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں اور سرکار نے جن کی بہاریں لُوٹ لی ہیں، وہ بھی دِل کی

بگنی ، امن ، شانتی اور سکون کی دولت سے بھرنا چاہتے ہیں لیکن اُنکے سرکش بچوں نے جنونی مسلک کے کندھوں پر چڑھ کر بڑی آفت مچا رکھی ہے ۔ وہ موت کے ساتھ مذاق کرتے رہتے ہیں جس کے کارن لوگوں کے گھر اور کلیجے جلتے سڑتے رہتے ہیں اور دُکھ درد اُنکو سونے نہیں دیتے ۔ مجھے دیوی ماں اور میرے مُرشد نے سمجھایا کہ ابھی بھی بیریوں سے گرے بیروں کا کُچھ نہیں بگڑا اور ہدایت کی کہ میں پیار سمندر سُوکھنے نہ دُوں ۔ مٹی کا موہ مِٹنے نہ دُوں اور رِشتوں کی جڑیں کٹنے نہ دُوں ۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ میں باگڑ بلّوں کو ننگا کر دُوں اور خلقت کو ست رنگا کر دُوں ۔ اُنہوں نے مُجھے میٹھی اور کڑوی رُوحوں سے بھری ایک پوٹلی دی اور کہا کہ نفرت ، حسد اور بُخل والی رُوحوں اور شکر قند میں گُھلی روحوں کو الگ الگ کروں اور اِنکو نام نہاد مذہبی پیشواؤں اور سیاسی بن مانسوں سے بچاؤں اور سمجھاؤں کہ اپنی مٹی کو اتنا نہ کھودا جائے کہ زمین وقت سے پہلے بنجر ہو جائے ۔

بہت دیر تک میں نے اِس پوٹلی کو اپنے نُوری رِشموں والے حُجرے میں سنبھال کر رکھا ــــــــ پھر ایک دِن میں نے دیکھا کہ حُجرے میں کرنیں مدھم پڑ رہی ہیں اور ایک حصّے میں اندھیرا پھیل چُکا ہے ۔ میں ڈر گیا اور فوراً حُجرے کا دروازہ کھولا ۔ میں نے دیکھا کہ پوٹلی کے اندر لُوبان کی خوشبو ، عداوت کی بدبُو میں غائب ہو رہی ہے ۔ میں نے پوٹلی کو حُجرے سے باہر نکالا اور گانٹھ کھول کر رُوحوں کی چھانٹی کرنے لگا تا کہ میٹھی اور کڑوی رُوحوں کو علیحدہ کر سکوں ــــــــ حسد ، بُغض ، دُکھ درد اور مصیبتوں کے ساتھ ساتھ دوستی ، دِلداری اور ہمدردی سے لبریز رُوحوں کو الگ کرنے میں مجھے کافی وقت لگا ۔ کڑوی رُوحوں کو ایک طرف کر کے میں سوچنے لگا کہ اِن کا علاج کیسے کیا جائے ۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ گُل بکاؤلی اور سنجیونی

بوٹی سے کدورت بھری اِن رُوحوں کا علاج کروں گا اور اِن کے اندر جمی کڑواہٹ کو ختم کر کے انکی جائز اُمنگوں کے ساتھ جُڑی محرومیوں کو دُور کروں گا۔ مگر اِس سے پہلے میں نے سبھی رُوحوں کا ڈی، این، اے کرایا تو پتہ چلا کہ سبھی ایک ہی نسل، زبان اور تمدن کی وارث رُوحیں ہیں۔ کڑوی رُوحوں میں سے کُچھ نے تو اپنا ضمیر بیچ ڈالا تھا جبکہ کُچھ رُوحوں کی برہمی واجب تھی۔ لیکن میٹھی رُوحوں کے ضمیر زندہ تھے اور یہ پورے عزم کے ساتھ اپنی نسل، بھاشا اور سبھیا چار سے جُڑی ہوئی تھیں۔ ثبوت کے طور پر اِن نیک رُوحوں میں سے کچھ انمول رُوحوں کو میں آپ سے ملاتا ہوں کیونکہ آج کے سائنسی دور میں میڈیا کے تمام ذرائع جھوٹ کا کاروبار چلا رہے ہیں۔ اِن اداروں نے مکّر چکّر کا ایسا جال بچھایا ہوا ہے کہ لوگوں کے سوچنے سمجھنے کی طاقت، عقل و دانش سب ماری گئی ہے۔ میڈیا کے کلاکاروں نے ایسی دھمال مچائی ہوئی ہے کہ اِس شور شرابے میں سچ ڈھونڈنا ناممکن ہو گیا ہے۔ دانشور اور حق سچ کے دربان اپنی عزّت بچانے کیلئے چھپتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چوروں کے آنگن میں ناچے کون۔

جاگتے ضمیر والی ایک رُوح رینو بخشی کی ہے جسکا سارا کنبہ بھارت پاکستان کی خبطی اور دِل جلی سیاست اور نام نہاد جہاد کی بھینٹ چڑھ کے دہلی ہجرت کر گیا۔ دہلی میں شاہراہوں کی خاک چھاننے اور رت جگوں کی مار سہتے وہ پڑھی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کیلئے سڑکیں ناپتی اور ٹھوکریں کھاتی رہی۔ آخر اُسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری مل گئی اور وہ کویت چلی گئی لیکن وہ کشمیری معاشرے کو بھولی نہیں۔ کشمیریت اور ریشیت کی جڑیں اُسکے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اکثر خوابوں کے اُڑن کھٹولے میں

بیٹھ کر کشمیر جاتی ۔ اپنے گھر میں ناچتی کودتی ۔ لوک گیت گاتی ۔ سیبوں کے باغ میں امنبری سیب کھاتی ۔ گھر والوں کے ساتھ ''بادام واری'' اور ''دُودھ پتھری'' کی سیر کرتی لیکن نیند کھلتے ہی اُسکے خواب ٹوٹ جاتے ۔ وہ اُداس ہو جاتی اور کشمیر میں چل رہے بارُود کے کھیل سے دُکھی رہتی ۔ وہ اپنی نسل کو اُجڑنے سے بچانا چاہتی تھی کیونکہ اُس کا من رُوپی بُت تو کویت میں رہتا تھا لیکن اُسکا چِت کبھی کشمیر سے باہر نہیں گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اُسکی دھرتی کی ساری پوتّر پوتھیوں پر سیاسی دلالوں اور مذہبی کنگالوں نے سیاہی پوت دی ہے جسکی وجہ سے رِشتوں میں دراڑ پڑ گئی ہے مگر وہ ریشیت کی دولت سے مالا مال ''موجِ کشمیر'' کی خدمت کرنا چاہتی تھی ___ ایک دِن اُس نے اخبار میں ایک ''اپیل'' پڑھی ۔ مشتاق احمد پرے نے اپنی بیوی مسّرت جان کی بیماری کا علاج کرانے کیلئے سخی اور دریادِل کرم فرماؤں سے مالی مدد مانگی تھی ۔ مُشتاق احمد پرے پلوامہ ضلع کے گاؤں دُربگام کا دیہاڑی دار مزدُور تھا۔ دُکھوں کی برف کا پانی اُسکی آنکھوں سے ٹپکتا رہتا ___ رِینو بخشی نے جب مشتاق پرے کی اپیل پڑھی تو وہ ہل گئی ۔ اُس نے چھُٹی لی اور کشمیر چلی آئی ۔ اُس نے اپنے خرچے پر مسّرت جان کا آپریشن دہلی کے سرگنگا رام ہسپتال میں کرایا۔ اُسکی کیموتھریپی کرائی ۔ جب وہ صحت مند ہوئی تو اُسے واپس پلوامہ لائی ۔ اُسکے بچوں کو اچھا شہری بنانے کیلئے سکول میں داخل کرایا اور ایک موٹی رقم اُنکے تعلیمی اخراجات کیلئے جموں کشمیر بنک کی پلوامہ برانچ میں جمع کرائی ۔ ایک چھوٹا سا مکان خرید کے دِیا، جس میں آج وہ سب رہ رہے ہیں ۔ رِینو بخشی دو ایک مہینے کشمیر میں رہی ۔ اُس نے اپنے آبائی گھر کی مرمت کرائی ۔ اپنی سہیلیوں اور ہمسایوں کے گھروں میں دعوتیں کھائیں اور کھلائیں ۔ خوبصورت وادی کی بربادی پر اپنوں سے گلے لگ کر روئی اور پھر واپس کویت چلی گئی ۔

دوسری رُوح راجن زُتشی کی ہے جس کا پریوار 1990ء میں ہجرت کر کے جموں بس گیا تھا ۔جب بے روزگار کشمیری شرنارتھیوں کے لئے مرکزی سرکار نے کشمیر میں نوکریاں دینے کا منصوبہ بنایا تو راجن زُتشی بھی اننت ناگ کے ایک سکول میں ماسٹر لگ گیا۔ وہ اُن سرکاری کوارٹروں میں رہتا تھا جو ریاستی سرکار نے مشہور تیرتھ استھان مٹن میں اُنکے لئے بنائے تھے۔ وہ ہاپت نار گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک بار جب وہ اپنے آبائی کھنڈر مکان کو دیکھنے گیا تو اُسے پتہ چلا کہ گاؤں کی ایک بُوڑھی راجہ بیگم اپنے عیال کے ساتھ مٹی گارے سے بنے کچے مکان میں رہ رہی ہے، جس کی بوسیدہ لکڑی اور گھاس سے بنی چھت بارش اور برف باری میں ٹپکتی رہتی ہے۔ اُسکا بوڑھا خاوند کسی جہادی بنام فوجی کاروائی میں ایک ٹانگ گنوا کر گھر بیٹھ گیا تھا اور بیٹا پتھر بازی کے جُرم میں جیل کی سلاخوں کے اندر بند تھا۔ اُسکے بیوی بچے اور بوڑھا بوڑھی سب فاقہ کشی کا شکار تھے۔ بھوک اور لاچاری نے اُنکے جسموں کو نوچ ڈالا تھا۔ راجن زُتشی سے اُنکی بے بسی دیکھی نہیں گئی۔ اُس نے اپنی جمع پُونجی راجہ بیگم کے گھر کی ضرورتوں پر خرچ کر ڈالی اور کریانے کا سارا سامان خرید کر دیا۔ سردی اور کٹ گُشو سے بچنے کے لئے لنڈے بازار سے گرم کپڑے اور کمبل لا کے دیئے۔ پھر اُس نے اپنے دوستوں ونود تکو، ششی بھوشن، سُنیل رینہ اور رُوپ کرشن کے ساتھ مل کر راجہ بیگم کی مالی امداد کا بیڑا اُٹھایا اور اخبارات کے ذریعے اپیل جاری کی۔ اپنے پیسوں سے بنک میں اُسکا اکاؤنٹ کھلوایا۔ ایک سال کے اندر اندر دان پُن کرنے والے انسانیت کے پُجاریوں نے اُس کے بنک کھاتے میں سترہ لاکھ روپے جمع کرا دیئے۔ آج راجہ بیگم اپنے کُنبے کے ساتھ سُکھی جیون گذار رہی ہے اور اپنے اِن بیٹوں کو دُعائیں دے رہی ہے ۔پروفیسر نتاشا کول، صحافی ساگریکا کسو اور بے شمار کشمیری نوجوان کشمیریت اور ریشیت کی

وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو کچھ 1990ء میں کشمیریوں کے ساتھ ہوا اور جو کچھ اُنکے ساتھ پچھلی تین دہائیوں سے کشمیر میں ہورہا ہے، یہ سب بڑا بھیانک اور دردناک ہے لیکن اس کیلئے کشمیری عوام ذمے دار نہیں ہیں بلکہ یہاں کا سیاسی ٹکراؤ ہے جو سیاسی سانڈ اپنے مفاد کیلئے ختم نہیں ہونے دیتے اور ایک دوسرے کی پونچھ پر پاؤں رکھ کر راج نیتی کی ڈھول اُڑاتے رہتے ہیں۔

مشترکہ ورثہ اور انسانی قدروں کی مثال قاضی گُنڈ کے برج ناتھ کول کی بھی ہے جو 1990ء کی گڑبڑ میں جموں چلا گیا تھا، لیکن جانے سے پہلے اپنے بادام کے باغ اور دھان کے کھیت اپنے ہمسایے اور بچپن کے دوست غلام پنڈت کے حوالے کر گیا تھا۔ غلام محمد پنڈت ہر سال اُسکے باغ ٹھیکے پر دیتا اور آدھی فصل کے بدلے کھیتوں کی بوائی اور کٹائی کرا کے کمائی کی رقم جموں جا کر برج ناتھ کول کو دے آتا۔ نام نہاد مجاہدوں کو غلام پنڈت کی شرافت اور ایمانداری آنکھوں میں چبھنے لگی۔ اُنہوں نے اُس غریب کو مار ڈالا اور مکان جلا دیا۔ غلام پنڈت کی بیوہ اپنے دو بچوں کے ساتھ جلی ہوئی لکڑیوں سے بنی جھگی میں اپنی بدبختی پر روتی رہی۔ جب برج ناتھ کو اِس المناک حادثہ کا پتہ چلا تو وہ جموں سے قاضی گُنڈ آیا۔ اپنی زمین میں سے پانچ کنال اراضی کا ایک ٹکڑا غلام پنڈت کی بیوہ مہ جبین کے نام ہبہ کرا کے دیا، اور رہنے کیلئے پختہ مکان بنا کر دیا۔ آج مہ جبین سلائی، کڑھائی اور سوزنی کا کام کر کے اپنے بچوں کو پال رہی ہے۔ اُسکا بڑا بیٹا دسویں جماعت میں پڑھ رہا ہے اور چھوٹا ساتویں جماعت میں۔ اُنکی پڑھائی کا خرچہ برج ناتھ ہی اُٹھا رہا ہے کیونکہ مہ جبین اور اُسکے بیٹے آج بھی برج ناتھ کول کی جائیداد کی رکھوالی کرتے ہیں۔

میں نے پوٹلی میں سے کُچھ اور میٹھی رُوحوں کو نکالا، جن کے پیکر بید مُشک، گلاب اور پمپوش کی مہک سے چھلک رہے تھے۔ اِن مہکتے اور چہکتے پھولوں سے کشید کی ہوئی خُوشبو سے آپ بھی محظوظ ہوں ____ قاضی گُنڈ سے دو کلو میٹر دُور لوڈ ورا گاؤں کے مہاراج کرشن نے ناموافق حالات کے باوجود اپنی جنم بھومی چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا لیکن کُچھ سالوں کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ پھر کُچھ ہی مہینوں بعد اُسکی پتنی کا بھی دیہانت ہو گیا جو جموں کشمیر بنک کی ملازمہ تھی۔ دونوں کا انتم سنسکار گاؤں والوں نے ہندو مان مریادا سے کیا۔ اُن کے چار بچے ہیں اور سب سے بڑی مینا کول ہے جو ماں کی وفات کے وقت پندرہ سال کی تھی۔ جموں اور دہلی سے کئی رشتے داروں نے اُنھیں ساتھ لے جانے کیلئے بہت زور لگایا لیکن مینا کول نے اُنکی ایک نہ سُنی اور اپنی مٹی سے ناطہ توڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ مینا کول کے اِس فیصلے پر گاؤں والوں نے حلف لیا کہ وہ مینا کول اور اُسکے بہن بھائیوں کی پوری حفاظت کریں گے اور اُنکا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ گاؤں والے مِل کر مہاراج کرشن کی زمین کی بوائی کرتے اور فصل اُنکے گھر پہونچاتے۔ گاؤں سے دو عورتیں باری باری ہر رات اُنکے گھر سونے کیلئے جاتیں۔ جب بجلی کی شارٹ سرکٹ سے مینا کول کے مکان کا کُچھ حصہ جل گیا تو دیہاتیوں نے چندہ کر کے مکان کی مرمت کرائی اور نئے بستر کمبل اور ضرورت کا دوسرا سامان لا کر دیا۔ جب مینا کول اٹھارہ برس کی ہوئی تو اُسے ماں کی جگہ پر بنک میں کلرک کی نوکری مِل گئی۔ آج مینا کول اپنی بہن اور دو بھائیوں کی پرورش کر رہی ہے۔

2008ء میں جب امرناتھ شرائن بورڈ کو زمین الاٹ کرنے پر ٹکراؤ شروع ہوا تو کشمیر وادی

میں دومہینوں تک زوردار تحریک چلی ۔ سیاست کے ہرکاروں نے خوب نفرت پھیلائی۔
جموں سے بیوپاریوں نے کشمیر مال بھیجنا بند کردیا۔وادی میں کرفیو لگ گیا ۔جموں،سری
نگر شاہراہ بند ہونے کی وجہ سے بابا برفانی کے درشن کرنے آئے یاتری کشمیر میں پھنس گئے
۔مقامی لوگوں کے غُصے اور جلال کے آگے سرکار کی کوئی چال نہ چل سکی ۔ایسے لگتا تھا کہ
انڈے بُول میں اور بچے کھجور پر ہیں۔اُس وقت کشمیری نوجوانوں نے جگہ جگہ یاتریوں
کے لئے لنگر لگائے۔ اُنکے رہنے کا بندوبست کیا______ سری نگر کے محلّہ رینہ واری
کا موتی لال دھر ایک ایسا کشمیری تھا جو ملی ٹینسی کے باوجود اپنے گھر میں ڈٹا رہا۔ 2014ء
کے بھیانک سیلاب میں دریائے جہلم نے قہر ڈھایا اور پورا شہر پانی میں ڈوب گیا۔ ہزاروں
مکان ڈھیہ گئے ۔موتی لال دھر کا مکان بھی سیلاب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ محلے داروں نے
فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے موتی لال کا مکان بنایا جائے تا کہ اُسکا اہل وعیال سُکھ سے رہ
سکے۔ اسی طرح 2016ء میں جب ملی ٹنیٹ بُرہان وانی کو پولیس نے ماردیا تو پورے
کشمیر میں سرکار کے خلاف جلوس نکلے۔ پتھر بازی اور گولی باری میں لوگ لہُولہان
ہوئے ۔اُس وقت بھی عوام نے کشمیریت کو زندہ رکھا۔انت ناگ سے پہلگام جارہی ایک
یاتری بس حادثے کا شکار ہوگئی۔رات کے سناٹے میں جب چیخنے چِلاّنے کی آوازیں
گاؤں والوں نے سُنیں تو وہ حادثے والی جگہ پر پہونچے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے لگے
اور لاشوں کیلئے کفن کا انتظام کرنے لگے۔دیگر یاتریوں کو وہ اپنے گھروں میں لے گئے
۔یاتری بس اُتر پردیش کے شہر میرٹھ سے آئی تھی ۔ایک زخمی یاتری اجیت کمار اروڑہ
نے لوگوں کو بتایا کہ اُس نے پولیس تھانے میں کئی بار فون کیا لیکن کسی نے فون نہیں
اُٹھایا۔وہ فوجی کیمپ میں مدد مانگنے کیلئے گیا۔ پر سنتریوں نے گیٹ ہی نہیں کھولا۔صرف

مقامی لوگوں نے ہی اُنکی مدد کی۔

شوپیاں کے موضع تراپڑ پورہ کے ترلوکی ناتھ وانگنو کی پتنی، کولگام کے موضع مانوں کے جانکی ناتھ، گاندربل کے دیہات کولن گُنڈ کے اوتار کرشن، وسّن گام، ٹنگمرگ کے نریندر کول، پلوامہ کے موضع کارپورہ سرنو کے سوم ناتھ اور بے شمار کشمیری بہن بھائیوں کی فوتگی کے وقت اُنکی آخری رسومات کا سارا بندوبست مقامی لوگوں نے ہی کیا اور اب بھی کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اُنکی رگوں میں دوڑتا لہو، زبان اور طرزِ معاشرت سب مشترکہ ہے۔

پھر میں نے کڑوی روحوں کو اپنی گود میں لیا۔ اُنکے دماغوں میں جمی کڑواہٹ کو ختم کرنے کیلئے اُنھیں گُل بکاوَلی اور سنجیونی بوٹی کا جوشاندا بنا کر پلایا تاکہ وہ اپنی پیڑوں، دُکھوں اور تکلیفوں کا تذکرہ کر سکیں۔ تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ گلے شِکوے ہوئے۔ باہم مشورے ہوئے اور پھر دِلوں میں پڑیں گانٹھیں کھُلنے لگیں۔ منافرت اور عداوت کے بادل چھٹنے لگے۔ اُنھیں یہ بات سمجھ آگئی کہ سرکاروں کی ندیوں سے نکلی چاندی کی نہریں بے شک کالی بھیڑوں کے وارے نیارے کر دیتی ہیں لیکن یہ نہریں بنجر زمین کو سرسبز نہیں بنا سکتیں۔ لاکھ جتن کرنے پر بھی دھرتی کی چیخیں قابُو سے باہر ہو جاتی ہیں۔ پھر انتظامیہ اور سیکورٹی اداروں کو خِفت اُٹھانا پڑتی ہے۔

جوشاندے کا اثر کڑوی رُوحوں کے چہروں پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُنھیں للّ ماں اور نُند رِشی کے واکھ سُنائے اور سمجھایا کہ ہمارے لئے ایک در آگ ہے تو دوسرا در کھائی اور بیچ میں وحشی سیاست کی بادشاہی ہے اِس لئے فتنہ خیزوں کی باتوں میں آکر اپنی جنّت کو مزید دوزخ نہ بنایا جائے۔ اپنی عقل و دانش پر لگا زنگ اُتارا جائے۔ خربوزے اور چھُری

کا کھیل ہمیشہ کیلئے بند کر دیا جائے ، کیونکہ چھُری کا کچھ نہیں جاتا۔ چیر پھاڑ تو خربوزے کی ہی ہوتی ہے۔ لہذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم کشمیریت کا فِرن پہنے رکھیں اور ریشیت کا پشمینہ اوڑھے رکھیں، کیونکہ ہمارے لئے للّ ماں نے فرمایا تھا۔ ے

''شیو تمہیں ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے
مُورکھ! تم کیوں ہندو اور مسلمان میں فرق کرتے ہو
اگر مُکتی چاہتے ہو تو انسانوں کو بانٹنے کی بجائے
اپنی نسل کو پہچانو۔''

اور نُند ریشی نے کہا تھا۔ ے

''ہم ایک ہی ماں باپ کی سنتان ہیں
پھر یہ مخالفت اور نفرت کیوں
اِس دھرتی پر ہمیں
اپنے دُکھ سُکھ بانٹنے چاہیں۔''

اس لئے آئیں..... دُودھ اور شکر کی طرح اپنی زندگی کو فرحت بخش بنائیں اور صوفی سنتوں کی اِس دھرتی پر امن اور شانتی کے دیپ جلائیں۔

(رپورتاژ)
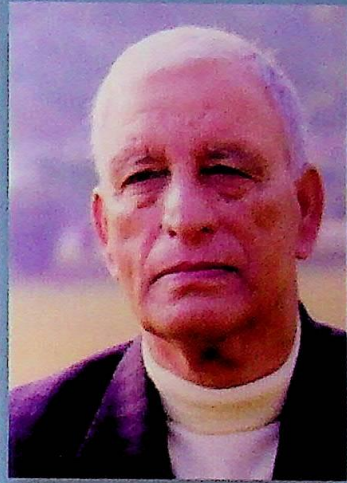
''خالد حسین ایک فطری، معتبر، کُہنہ مشق تخلیق کار ہیں جن کو اپنے فن پر کامل گرفت اور مہارت حاصل ہے۔ ''جنت گرہن'' افسانوی مجموعہ میں، دِل رُبا، دِل کش، دِل گداز، دِل سوز، دِل درد اور دل میں اُتر جانے والی کہانیاں موجود ہیں جو مدتوں دِل و دِماغ پر چھائی رہتی ہیں اور پڑھنے والے کی زندگی میں جذبات کی لہر بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔ کہانیوں میں اُردوئے معلّٰی کی شیریں اور سادہ زبان ہے۔ پنجابی محاورے اور اُردو کی ضرب المثلیں کہانی کے دستر خوان کو خوش ذائقہ اور خوش رنگ بنا دیتی ہیں بلکہ زبان پر اس کا چٹخارہ بڑی مدت تک باقی رہتا ہے''

سیّد تقی عابدی

''جنت گرہن'' کے افسانے لِکھ کر جہاں خالد حسین نے اپنی مٹی کا قرض اُتارا ہے، وہیں دوسری جانب اپنے مخصوص انداز میں افسانہ نگاری کے عصری مزاج اور معیار کا ساتھ بھی نبھایا ہے۔ عالمی سطح پر بھی افسانوی ادب کا عصری رویہ یہی ہے کہ اپنے مانوس ماحول اور معاشرہ کے سچے حالات و کوائف کو اُس کی جزئیات کے ساتھ ایمانداری سے بیان کیا جائے۔ خالد حسین کے ان افسانوں میں بھی ایسا ہی سچا اور ایماندارانہ تخلیقی رویہ ملتا ہے۔ جدید اور مابعد جدید افسانہ نگاری کے اس دور میں ''جنت گرہن'' کے افسانے ''معاصر افسانہ'' کی شعریات سے بہ یک وقت مفاہمت اور مزاحمت دونوں کا رشتہ نبھاتے ہوئے بھی افسانے کی ایک الگ ہی قسم کی بوطیقا کے خد و خال نمایاں کرتے محسوس ہوتے ہیں''

پروفیسر قدوس جاوید

''خالد حسین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے دو باتوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ پہلی، اُس کی کہانیوں میں کہانی پن کا مضبوط اظہار اور دوسری، اُسکی زبان کی خوبصورتی، کہانیوں کا بیانیہ اور منفرد اسلوب اُسکی خوبی بھی ہے اور شناخت بھی''

منموہن

Khalid Hussain

A Group of
Chetna Parkashan
Ludhiana | Kotkapura | Canada | USA
ISBN 93-89997-93-3
9789389997934
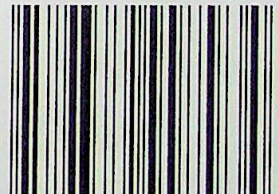
Jannat Grahan
₹ 300/-